جہازی بھائی
سفرنامہ
رضا علی عابدی

رضا علی عابدی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

910.4 Raza Ali Aabdi
Jahaazi Bhai/ Raza Ali Aabdi.- Lahore :
Sang-e-Meel Publications, 2015.
136pp.
1. Urdu Literature - Travelogue.
I. Title.

2015ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-0677-4
ISBN-13: 978-969-35-0677-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

جہازی بھائی

Mauritius
0
5
10 km
INDIAN OCEAN
Ile Plate
Coin de Mire
Cap Malheureux
Pereybère
Grand Gaube
Pointe aux Canonniers
Grand Baie
Trou aux Biches
Goodlands
Ile d'Ambre
Triolet
RIVIÈRE DU REMPART
Sir Seewoosagur Ramgoolam Botanic Gardens
Poudre d'Or
Baie du Tombeau
Pamplemousses
Belle Vue Maurel
PORT LOUIS
PAMPLEMOUSSES
Bon Acceuil
Poste de Flacq
Pointe aux Sables
PORT LOUIS
Pieter Both
Le Pouce
Centre de Flacq
Belle Mare
MOKA
Beau Bassin
Quartier Militaire
La Ferme
Rose Hill
FLACQ
Quatre Bornes
Flic en Flac
Montagne Blanche
Phoenix
Montagne du Rempart
Trois Mamelles
Vacoas
Montagne Blanche
Ile aux Cerfs
Piton du Milieu Reservoir
Curepipe
RIVIÈRE NOIRE
PLAINES WILHELMS
Montagnes Bambous
Tamarin
Tourelle du Tamarin
Tamarind Falls Reservoir
Vieux Grand Port
Mare Longue Reservoir
Nouvelle France
GRAND PORT
Piton de la Petite Rivière Noire
Mare aux Vacoas
Ile aux Bénitiers
Grand Bassin
Rose Belle
Mahébourg
Chamarel
Montagne Cocotte
Ile aux Aigrettes
Airport
Le Morne Brabant
Plaisance
SAVANNE
Baie du Cap
Chamouny
Bel Ombre
Chemin Grenier
Surinam
Rivière des Anguilles
Souillac

بچھڑے ہوؤں کی کہانیاں

بحرہند کے چھوٹے سے جزیرے ماریشس کا حال اس کورے کاغذ جیسا ہے جو برسہا برس سادہ رہا کیونکہ وہاں تک نشان ڈالنے والی تمام اشیاء کی رسائی نہیں تھی۔

پھر ایک روز یہ ہوا کہ رسائی ہو گئی۔ ہر طرف سے ہر قسم کے نظریے نے یلغار کی اور اس کورے کاغذ پر اپنے اپنے نقش بنانا شروع کر دیئے، وہ بھی اس شدومد سے جیسے نئے پرانے سارے حساب چکائے جا رہے ہوں۔

ان نقوش کی فہرست طویل ہے: مذہب کے نقش، لادینیت کے نقش، قوم پرستی اور زبان پرستی کے نقش، فلموں، ویڈیو اور ٹیلی ویژن کے نقش، رسالوں، کتابوں، کمپیوٹروں کے نقش، دنیا بھر کی حجاب پوش ثقافتوں سے لے کر برہنہ ثقافتوں تک کے نقش، اور ان سب کے علاوہ منشیات کے نقش جنھوں نے صدیوں پرانے اس نازک سے سادہ ورق میں سوراخ کر دیئے ہیں۔

یہ کتاب اس کورے کاغذ اور ان پر ابھرنے یا ابھارے جانے والے نقوش کی کہانی ہے۔

دنیا بھر کے جزیروں میں ایک ماریشس ہی کیوں چنا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ان چار پانچ جزیروں میں سے ایک ہے جس میں پچھلی صدی کے دوران برصغیر کے محنت کشوں کو لے جا کر اور غلامی کے طوق پہنا کر بسایا گیا تھا۔ ان جزیروں کے اطراف پانی کا سمندر ہے۔ لیکن خود ان جزیروں کے اندر جب بہار' مشرقی یو پی' بنگال' مدراس اور بمبئ کے جفاکش اور محنت کش کھیت مزدوروں کے خون پسینے کے سمندر بہائے گئے تو ان کی معیشت کی وہ عمارت کھڑی ہوئی جو آج تک کھڑی ہے۔

ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ ہندوستان والے بھول بھال گئے کہ ان کے بزرگ جہازوں میں بھر بھر کر کہاں لے جائے گئے لیکن وہاں گنے کے کھیتوں کے پچھواڑے بیٹھے ہوئے وہ لوگ آج بھی سوچ رہے ہیں کہ کبھی موقع ملے تو واپس جائیں۔ واپس جا کر وہ قصبے' وہ گلیاں اور وہ مکاں دیکھیں جہاں سے ان کے دادا کے دادا اس دور دراز منزل کے لئے نکلے تھے جہاں سے پھر شاید ہی کبھی کسی کو واپس جانا نصیب ہوا۔

یہ ان ہی بچھڑے ہوؤں کی کہانیاں ہیں۔

ستمبر ۹۴ء میں ماریشس کے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ نے اسد اللہ خاں غالب کے ۱۲۵ ویں یوم وفات پر ایک کانفرنس کی تھی۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ علی گڑھ سے پروفیسر نعیم احمد' لکھنؤ سے پروفیسر محمود الحسن اور حیدر آباد دکن سے پروفیسر یوسف شریف الدین سرمست بلائے گئے تھے۔ جلسے ہوئے' مذاکرے اور مباحثے ہوئے' ملاقاتیں

ہوئیں اور معانقے ہوئے۔

یہ ان ہی دنوں کی کہانیاں ہیں۔

ان کی تکمیل میں ماریشس کے بہت سارے احباب کا تعاون شامل ہے۔ وہ سب ان کہانیوں کے کردار بھی ہیں۔ میں ان سب کا بہت شکر گزار ہوں۔

لیکن سب سے بڑھ کر میں اپنی پہلی والی تصانیف 'کتب خانہ' جرنیلی سڑک' شیر دریا اور اپنی آواز کے پڑھنے والوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میرا حوصلہ بڑھایا اور اس طرح یہ کتاب لکھی گئی اور مکمل ہوئی۔

جرنیلی سڑک اور شیر دریا کے بارے میں یہ بحث آج بھی جاری ہے کہ وہ سفرنامے ہیں یا نہیں۔ یہ تازہ تصنیف بھی اس بحث کے دائرے سے خارج نہ ہو گی۔

پڑھ کر لطف اٹھائیے اور فیصلہ کیجئے کہ یہ سفرنامہ ہے یا نہیں۔

رضا علی عابدی

۲۶ دسمبر ۱۹۹۵ء

لندن
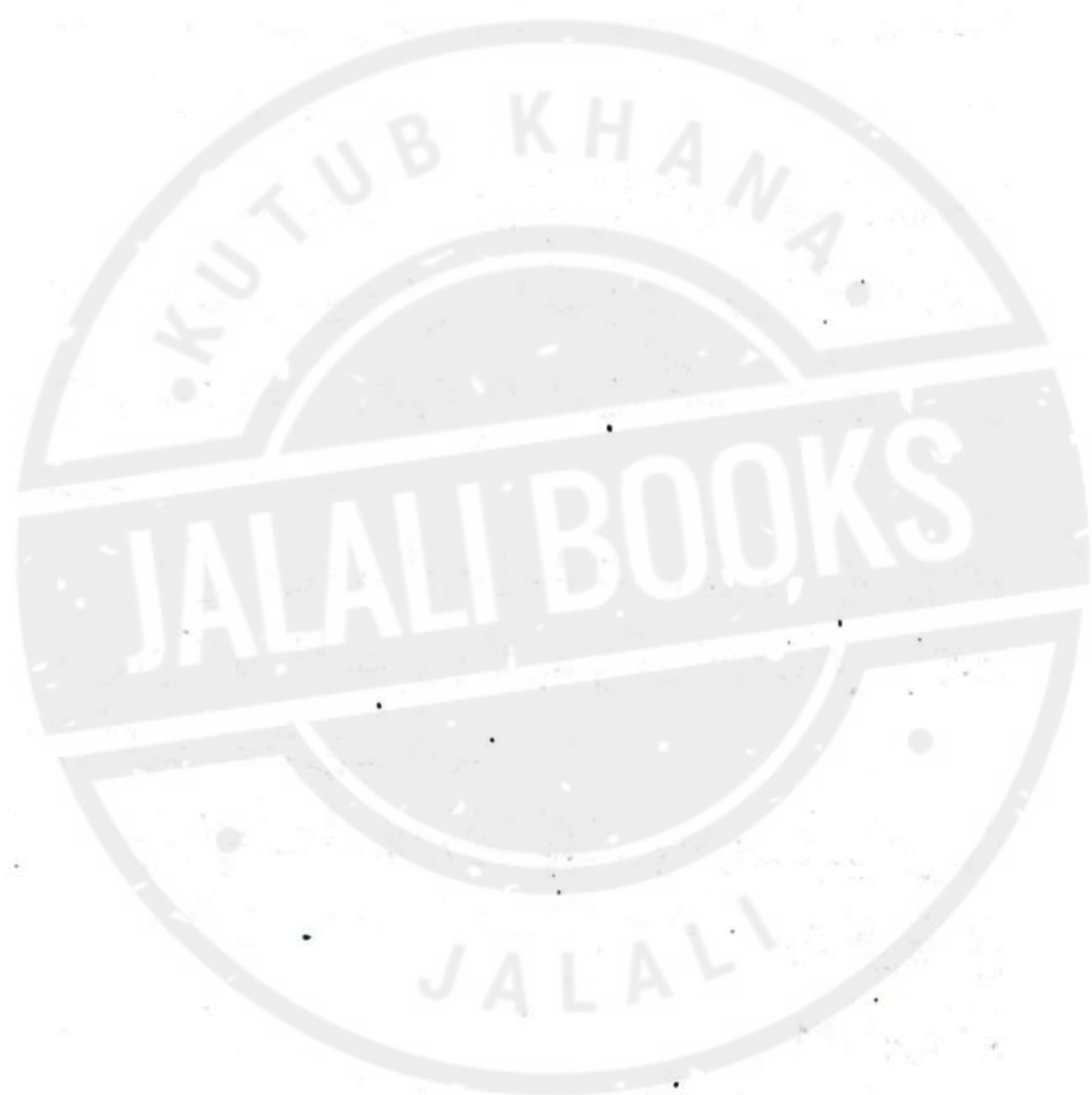
مزدوروں کے اہرام

طیارے کی رفتار سست پڑنے لگی۔ وہ نیچا ہوتے ہوتے بادلوں میں اڑنے لگا۔ ذرا دیر بعد بادل چھٹ گئے۔ اب اوپر نیلا آسمان تھا۔ نیچے اس سے بھی زیادہ نیلا سمندر تھا اور نیلے سمندر کے بیچ ایک سبز جزیرہ یوں نظر آیا جیسے کسی ماہر کاریگر نے بہت بڑے فیروزے کے قلب میں بہت چھوٹا سا ہرا نگینہ اُتار دیا ہو۔

یہی ماریشس تھا۔

میں تجسّس کے مارے ہوئے کمسن بچے کی طرح نیچے جھانکنے لگا۔ ایک میں ہی کیا' سارے مسافر کھڑکی سے باہر یوں دیکھنے لگے کہ کہیں کوئی منظر نگاہوں میں محفوظ ہونے سے رہ نہ جائے۔

کوئی مخروطی پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا' کوئی جا بجا بہتے ہوئے چشموں کو۔ کسی کی نگاہ جھیلوں پر تھی اور کسی کی نظر دور دور تک پھیلے ہوئے گنّے کے کھیتوں پر۔ مگر میری آنکھوں نے ان کھیتوں کے بیچ ایک نیا منظر دیکھا۔

ہر کھیت میں پتھروں کے اہرام کھڑے تھے۔ دو دو تین تین اہرام۔ کہیں ایک قطار میں کہیں بے ترتیبی سے۔

طیارہ نیچا ہونے لگا تو وہ اور قریب، اور صاف نظر آنے لگے۔ کسی نے پتھر چن چن کر دس بیس نہیں، سو پچاس نہیں، ہزاروں اہرام تعمیر کئے تھے۔

میں نے بیتاب ہو کر اپنے برابر بیٹھے ہوئے ماریشس کے باشندے سے پوچھا۔ "یہ کیا ہیں؟"

فوراً ہی جواب مل گیا۔ "پتھر"

پھر میں ہوائی اڈے پر اترا اور اپنے میزبانوں کی کار میں بیٹھ کر شہر کی جانب چلا تو راستے بھر گنے کے کھیت بھی چلے۔ ان کھیتوں میں بھی وہی اہرام کھڑے تھے۔ میں نے کسی سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

اب کے ذرا تفصیل سے جواب ملا۔ "کسی زمانے میں یہ کھیت تیار کئے گئے ہوں گے، اس وقت مٹی سے جو پتھر نکلے ان کے ڈھیر لگا دیئے گئے۔"

میں ہوٹل پہنچا تو ایک نوجوان نے میرا سامان میرے کمرے میں پہنچایا۔ بھلا سا ہونہار نوجوان تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا" میں نے اپنی ٹائی کھولتے ہوئے پوچھا

"کریم بلا۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"یہیں۔ ماریشس کے۔"

میں نے اپنا ایک جوتا کھولتے ہوئے پوچھا۔" کریم بلا۔ کچھ تمہیں پتہ ہے یہ ماریشس کے کھیتوں میں بڑے بڑے وزنی پتھروں کے اہرام کس نے بنائے تھے؟"

"ہاں پتہ ہے۔"

میں ڈوری کھولتے کھولتے رک گیا اور پوچھا۔ "کس نے؟"

"جہازی بھائیوں نے۔"

میں نے دوسرا جوتا کھولتے ہوئے پوچھا۔ اور اس بار میرے سوال میں سوال کم اور حیرت زیادہ تھی۔ "کس نے؟"

"جہازی بھائیوں نے۔ میرے دادا کے دادا نے۔"

میں نے اپنا سوٹ کیس کھول کر اس میں سے سلیپر نکالتے ہوئے پوچھا۔ "کون تھے تمہارے دادا کے دادا؟"

"بلا صاحب۔ کلکتے سے چلے تھے۔ ان کے جہاز کا نام شاہ عالم تھا۔ ۹ جون ۱۸۸۵ء کو یہاں ماریچ پہنچے تھے۔"

"ماریچ؟"

"ہاں' وہ لوگ اس جزیرے کو ماریچ کہتے تھے۔ ہاں تو میرے دادا کے دادا ۹ جون کو پہنچے تھے۔ اس وقت ان کی عمر انیس سال تھی۔ ذات کے مسلمان تھے۔ قد چھوٹا تھا۔ ماتھے پر زخم کا نشان تھا۔ ان کے والد کا نام تاجو تھا۔ غازی پور کے رہنے والے تھے۔ ۲۱ جون ۱۸۹۹ء کو مرے تھے۔ اب تک لال سیاہی سے لکھا ہوا ہے۔"

میں اس کی باتوں میں کھو گیا اور سلیپر پہننا بھول گیا۔ "کہاں لکھا ہے لال سیاہی سے؟ تمہیں اپنے دادا کے دادا کی اتنی اتنی سی تفصیل کیسے معلوم ہوئی؟"

"سب رجسٹروں میں لکھی ہوئی ہے۔ ۷۵ برس میں ساڑھے چار لاکھ مزدور جہازوں میں بھر بھر کر بمبئی' مدراس اور کلکتے سے یہاں

لائے گئے۔ بندرگاہ پر اتار کر وہ قطاروں میں کھڑے کر دیئے جاتے تھے۔ گورے لوگ بڑے بڑے رجسٹر کھول کر بیٹھتے تھے اور ہمارے بزرگوں کے بارے میں یہ تمام باتیں درج کرتے تھے۔ خوشنویس گوروں کے لکھے ہوئے وہ سینکڑوں رجسٹر آج تک محفوظ ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ میں۔ آپ ضرور دیکھئے۔ دیکھنے کی جگہ ہے۔ ہم جتنے ہندوستانی یہاں آباد ہیں۔ سب کے باپ دادا کا حال اور ذات پات کا حال وہاں درج ہے۔ بلکہ جو لوگ کیمرہ آنے کے بعد آئے ان سب کی تو تصویریں بھی رجسٹروں میں چپکی ہوئی ہیں۔ ذرا جا کر دیکھئے۔ خاص طور سے ان کی آنکھوں میں چھپا ہوا احساس ضرور دیکھئے۔"

"جہازی بھائی تھے وہ؟"

"ہاں۔ ان کے رنگ روپ الگ تھے' دین اور مذہب الگ تھے۔ بولیاں جدا تھیں۔ لہجے مختلف تھے۔ سب ایک ہی جہاز میں ٹھونس دیئے جاتے تھے۔ دو چار روز انہیں چپ لگی رہتی تھی۔ بالآخر بولتے تھے تو آپس میں ایک دوسرے کو جہازی بھائی کہہ کر بلاتے تھے۔"

"تو تمہارے دادا کے دادا کا نام بلا تھا؟"

"جی ہاں۔ آپ دل ہی دل میں ہنس رہے ہوں گے اس نام پر' مگر ہم لوگوں کو ہنسی نہیں آتی۔ میرے دوستوں کے بزرگوں کے نام بھی ایسے ہی تھے۔ کسی کا نام پیرو تھا' کسی کا منگلی' کوئی کرمو تھا اور کوئی

گودڑ۔ ہم نے یہی نام آج تک سینے سے لگا رکھے ہیں۔ بلکہ غضب تو یہ ہے کہ جو کچھ گورے محرر کی سمجھ میں آیا اس نے لکھ دیا۔ امام بخش کو ایمام بوکس۔ رجب علی کو راجاہ بالی۔ رحمت اللہ کو رام ٹولہ۔ ہم نے نہ صرف وہ نام بلکہ وہ ہجے بھی قبول کر لئے ہیں۔ بس اب یہی ہمارے نام ہیں۔ ہم ان پر شرمندہ نہیں۔"

کریم بلا کی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ اس کا ایک ساتھی اسے ڈھونڈتا ہوا آ گیا۔ کریم بلا بولا ——— "اس سے ملئے۔ میرا دوست ہے، اسماعیل جھگڑا۔"

گنی کی جگہ گنا

"میرا نام قاسم ہیرا ہے۔"

وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ چھریرا بدن' اچھا قد' کھلتا ہوا رنگ' سر کے بال اور مونچھیں ذرا سی زیادہ کالی' یو پی کے لہجے میں تھوڑا سا ماریشس کا لہجہ اور چہرے کی جھریوں میں بلا کی ذہانت۔

"میرا نام قاسم ہیرا ہے۔"

"آیئے آیئے۔" میں نے سفر کی تکان کے باوجود گرم جوشی کا جس قدر ممکن تھا مظاہرہ کیا۔ "ہیرا صاحب' میں آپ کے نام سے واقف ہوں' ہمایوں ظفر زیدی نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ آپ دونوں شاید اکٹھا پڑھتے تھے علی گڑھ میں؟"

"جی ہاں۔ ہم دونوں ہم جماعت تھے۔" یہ کہتے کہتے قاسم ہیرا سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کی کشادہ پیشانی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ ماریشس کے پرانے باشندے نہیں لگتے۔"

وہ بولے ——— "جی نہیں۔ میں بہت پرانا باشندہ ہوں۔"

"ہیرا کیا آپ کے والد کا نام تھا؟"

"جی ہاں' میرے سارے بزرگوں کا نام ہیرا تھا۔"

"ان کا بھی جو پہلی بار سمندری جہاز سے اس سرزمین پہ اترے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا ان کا ریکارڈ بھی محفوظ ہے رجسٹروں میں؟"

"جی"

"آپ نے دیکھا ہے؟"

"جی"

بس اس سے زیادہ اگر کسی نے اپنے بزرگوں کے متعلق بتایا تو وہ کریم بلا تھا۔ اکثر نے بات کا رخ ادھر جانے نہیں دیا۔ بیشتر نے لاعلمی ظاہر کی لیکن بعض نے اشارتاً مگر فخریہ قبول کیا کہ وہ جہازی بھائیوں کی اولاد ہیں۔

قاسم ہیرا علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں' ان کے والد بڑے اچھے مصور تھے اور شیشے کی پشت پر نہایت عمدہ روغنی تصویریں بناتے تھے جو فریموں میں آراستہ آج تک ان کے چھوٹے سے آرام دہ مکان کے ہر کمرے اور راہ داری میں لگی ہیں۔

"ہیرا صاحب' یہ جہازی بھائی کون تھے۔" میرا یہ پوچھنا تھا کہ تاریخ کے دفتر کھل گئے۔"

"ہوا یہ کہ ماریشس میں سب سے پہلے عرب آئے۔ یہ چھٹی صدی کے وسط کی بات ہے۔ ان کے بعد واسکوڈی گاما ادھر سے گزرا۔ پھر پرتگالی آئے' ان کے بعد ولندیزی آئے۔ نہر سوئز تو اس وقت تھی نہیں۔ ہندوستان اور مشرق بعید جانے والوں کو راس امید کا چکر کاٹ

کر ادھر ہی سے گزرنا پڑتا تھا۔

ولندیزیوں نے اس جزیرے پر اپنا جھنڈا گاڑا اور یہاں کی زمین سے دولت اگانے کے لئے باہر سے غلام لانے شروع کئے۔ وہ ملایا سے' جاوا سے' مڈغاسکر سے اور سب سے بڑھ کر ہندوستان سے غلام لاتے انہوں ہی نے نساؤ کے شہزادہ ماریس کے نام پر اس جزیرے کا نام ماریشس رکھا۔ ظالم بہت تھے' لہٰذا غلاموں پر مظالم توڑنے شروع کئے۔ ظلم جب بہت بڑھا تو اس جزیرے کی تاریخ میں پہلی بار غلاموں کی بغاوت ہوئی۔ آخر تنگ آ کر ولندیزی اس جزیرے کو چھوڑ گئے اور یہ کہتے ہوئے گئے کہ یہاں چوہے بہت ہیں' سارا غلہ کھا جاتے ہیں۔"

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا ــــــ "مجھے یقین ہے ولندیزیوں کے بعد یہاں انگریز آئے ہوں گے۔"

"جی نہیں' نئی نئی زمینوں پر قبضے جمانے کی دوڑ میں فرانس والے ان سے آگے تھے۔ ۱۷۱۵ء میں فرانسیسی جہاز اپنے جھنڈے لہراتے ہوئے ان ساحلوں پر لگے اور اب جو انہوں نے ہماری زمین پر قدم رکھا تو وہ قدم آج تک جما ہوا ہے۔ انہیں چوہوں نے' غلاموں نے اور انگریزوں نے' سب نے پریشان کیا۔ سلطنت برطانیہ نے انہیں شکست دے کر ماریشس ان سے چھین لیا مگر ان زمینوں' ان فصلوں' ان ملوں اور ان کارخانوں پر آج تک فرانسیسی نسل کے باشندوں کا غلبہ ہے۔"

"اور غلاموں کا کیا حال ہوا ان کے دور میں؟"

"غلام تو خوب لائے گئے۔ فرانس والوں نے ۱۷۲۱ء میں

ماریشس کو اپنی نو آبادی بنایا اور غلام لانا شروع کیے۔ ۱۷۲۲ء میں یہاں مسلمان آئے۔ اذانیں دی گئیں اور نمازیں پڑھی گئیں۔ اور پچاس برسوں کے دوران یہاں پندرہ ہزار غلام آچکے تھے۔ اور چالیس سال بعد ہمارے اس جزیرے میں غلاموں کی تعداد ۶۵ ہزار تھی۔"

"آپ کا مطلب ہے زر خرید غلام؟"

"جی۔ زر خرید غلام' جو کوڑیوں کے مول لائے گئے۔ اور جن سے مشقت کرا کے اس زمین سے سونا اگلوایا گیا۔"

"بڑی اچھی اردو بولتے ہیں آپ۔"

وہ ہنس کر خاموش ہو گئے۔ اور پھر غلاموں کے بارے میں بتانے لگے۔ "گوروں نے یہ تو جان لیا کہ ان زمینوں میں ہزاروں مزدور لگا کر بیک وقت بہت زیادہ فصل اگائی جائے تو اس میں منافع زیادہ ہے چنانچہ ہزاروں غلاموں کو گائے بیلوں کی طرح جوت دیا گیا اور میدان صاف کرا کے ان میں اتنا زیادہ گنا اگایا گیا کہ کارخانوں سے شکر اُبلنے لگی۔

مزدوروں سے بے پناہ محنت کرانے کا یہ تجربہ اتنا کامیاب رہا کہ پھر گویانا' ٹرینیڈاڈ' جنوبی افریقہ' سرینام' اور فیجی میں بھی غلاموں کی ڈھلائی شروع ہو گئی اور دنیا کے بازار جھلملاتی جگمگاتی سفید شکر سے بھر گئے۔"

میں نے پھر بات کاٹی —— "یہ سب کچھ ہوا اور ہمارے انگریز دور بیٹھے دیکھتے رہے؟"

"جی نہیں۔ انہیں آکر رہنا تھا اور وہ آکے رہے۔"

غلاموں کے سجدے

ایک روز میرے میزبان مجھے جنوب مشرقی ساحل پر اس جگہ لے گئے جہاں فرانس والوں کو یقین تھا کہ انگریز حملہ کریں گے۔ نیچے ساحل سے لے کر پشت پر واقع پہاڑی کی چوٹی تک اتنے مضبوط اور مستحکم دمدمے اور مورچے بنوائے گئے تھے کہ ۱۸۱۰ء سے آج تک ان کا ایک پتھر بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکا۔ کسی نے کہا ——— "یہ دیکھئے۔ غلاموں نے یہ فصیلیں بناتے ہوئے خون پسینہ ایک کیا ہے۔"

ہوتا یہ تھا کہ ہندوستان اور چین جانے کے لئے انگریزوں کے سمندری جہاز راس امید کا چکر کاٹ کر ادھر سے گزرتے تھے۔ یہاں فرانس والے انہیں لوٹتے تھے اور گھر بیٹھے آرم سے کھاتے تھے البتہ جانتے تھے انگریز ایک روز پلٹ کروار ضرور کریں گے۔

اسی دوران انگریزوں کے جنگی جہازوں نے ماریشس کے جنوب مشرقی ساحل کی طرف نقل و حرکت شروع کی۔ فرانسیسیوں نے جھٹ غلاموں کو مورچے بنانے پر لگا دیا۔ آخر ایک روز برطانیہ کے چار جنگی جہاز آپہنچے۔ زور کا معرکہ ہوا۔ فرانسیسی توپ خانے نے ایسی آگ اگلی کہ انگریزوں کو ہار ماننا پڑی۔ فرانس والے خوشی سے دیوانے

ہو گئے اور پیرس کی محراب فتح پر نپولین کی عظیم فتوحات کے ساتھ ساتھ انہوں نے ماریشس کے ساحل پر اپنی اس فتح کا احوال بھی کندہ کرا دیا۔

ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی انگریز جو بظاہر بایاں ہاتھ دکھا رہا ہے وہ دراصل دایاں ہاتھ مارے گا۔ فرانس والوں کو جنوب مشرقی ساحل پر الجھا کر انگریز ایک روز آئے اور جزیرے کے شمالی ساحل پر اتر گئے۔ انیسویں صدی کے ابھی دس سال ہی گزرے تھے اور ماہ نومبر ختم ہونے کو تھا۔ اس روز انگریز کے لشکر کے ہمراہ سرزمین ہندوستان کے دو ہزار سات سو سپاہی بھی تھے۔ یہ لوگ ماریشس کے ساحل پر اترے تو دور دور تک کوئی ان کی راہ روکنے والا بھی نہ تھا۔ نہ کوئی گولی چلی' نہ کوئی گھائل ہوا۔ پانچ دن بعد فرانسیسی گورنر نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ایک ہندوستانی فوجی کو حکم ہوا کہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر یونین جیک لہرائے۔

اس وقت جزیرہ ماریشس کی آبادی کچھ یوں تھی۔ سات ہزار گورے آبادکار' ساڑھے سات ہزار آزاد کردہ غلام' ساٹھ ہزار غلام اور چھ ہزار ہندوستانی۔

جزیرہ انگریزوں کو سونپ دیا گیا مگر ایک شرط پر۔ فرانسیسی طور طریقے برقرار رہیں گے۔ فرانسیسی باشندوں کی زبان اور مذہب جوں کا توں رہے گا۔ نپولین کا ضابطہ قانون رائج رہے گا اور گنے کے کھیت فرانسیسی باشندوں کی ملکیت رہیں گے۔ انگلستان والوں نے اپنا یہ وعدہ نبھایا۔ گنے کی فصل پر پلنے والے اہل فرانس اب دولت کے انبار پر

پلنے لگے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

انگریز گورنر نے آتے ہی ماریشس کی حالت سدھارنے کا کام شروع کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے گنے کا ایسا پودا تیار کرایا جسے طوفان اکھاڑ نہ سکے۔ برطانوی سائنسدانوں نے یہ کام کر دکھایا چنانچہ ماریشس میں باقاعدگی سے آنے والا طوفان اب صرف پپیتے کے کمزور درختوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کر کے گزر جاتا ہے۔

اس کے بعد گورنر بہادر نے جزیرے میں عمدہ اور پختہ سڑکیں بنانے کی ٹھانی۔ اس کے لئے جفاکش مزدور درکار تھے۔ اس کی نگاہ انتخاب ہندوستانی قید خانوں پر پڑی جہاں دوسرے مجرموں کے علاوہ بہت سے سپاہی بھی نظر بند تھے جنہیں فوجی یا سیاسی جرم پر بیڑیاں پہنائی گئی تھیں۔

برطانوی قبضے کے پانچ سال بعد قیدیوں کا پہلا قافلہ ماریشس کے ساحل پر اترا۔ ان لوگوں سے سڑکیں بنوائی گئیں۔ قلعے تعمیر کرائے گئے۔ ان میں سے بعض کو ریشم کے کیڑے پالنے کا تجربہ تھا۔ ان کے ہاتھوں ریشم کی صنعت شروع کرائی گئی۔ مگر اس میں ناکامی ہوئی۔

کہتے ہیں کہ یہ لوگ تپتی دھوپ میں سارا سارا دن پتھر کوٹا کرتے تھے اور رات کو اس سڑک کے کنارے پڑ کر سو رہتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک بوڑھے مزدور کو دیکھ کر ایک پادری' ریورینڈ پیٹرک بیٹن نے لکھا تھا کہ اس کا مشرقی ناک نقشہ' چمکدار آنکھیں اور سمندری ہوا میں لہراتی ہوئی ڈاڑھی دیکھ کر قدیم اور عظیم مصوروں کے ہاتھوں بنی ہوئی حضرت ابراہیمؑ کی شبیہہ یاد آ جاتی ہے۔ وہ

ہندوستانی رجمنٹ میں معمولی افسر تھا اور کسی سیاسی جرم کی پاداش میں یہاں کالے پانی بھیج دیا گیا تھا۔ یہ لوگ بیڑیاں پہن کر مشقت کرتے ہیں۔ گورے انسپکٹر ان کے سروں پر سوار رہتے ہیں اور رات کو انہیں قریب ہی عارضی جھونپڑیوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔

ریورینڈ بیٹن نے وہیں ایک چھوٹی سی عمارت دیکھی جس میں ان لوگوں نے اپنی مسجد بنالی تھی۔ آج میری چشم تصور دیکھ رہی ہے کہ وطن سے نکلے ہوئے بوڑھے سپاہی سجدوں میں جاتے ہوں گے تو ان کے سجدے طویل ہو جاتے ہوں گے اور جب وہ سر اٹھاتے ہوں گے تو ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہوتی ہوں گی۔ آج میری چشم تصور دیکھ رہی ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے وہ یہ نہیں پوچھتے ہوں گے کہ کیوں بھائی۔ یہ مسجد دیوبندی ہے یا بریلوی اور قطب نما دیکھ کر اس کا قبلہ درست کرلیا گیا ہے یا ہماری نمازیں ضائع کرو گے؟

پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ سزا یافتہ ہندوستانی سپاہی سر جھکا کر کام کرتے تھے۔ بلا کے اطاعت گزار تھے۔ اور اپنے رب کی اطاعت میں تو ان کا یہ حال تھا کہ ان کے منہ سے کبھی کسی نے شکایت کا ایک حرف نہیں سنا۔ ان کے ساتھ ہونے والا سلوک دیکھ کر دوسرے کانپ جاتے تھے مگر یہ خود دن کے خاتمہ پر رب کا شکر ادا کرتے تھے اور نماز فجر کا انتظار کرتے کرتے سو جاتے تھے۔

ایک گورنر کی بیوی کا وہ خط انگلستان میں موجود ہو گا جس میں اس نے ان جفاکش قیدیوں کو کام کرتے دیکھ کر لکھا تھا کہ "بے چاری مخلوق سے بیل کی طرح کام لیا جاتا ہے" اور بیل بھی ایسے کہ بیڑیوں

کے بوجھ سے جن کی کمر دوہری ہوئی جاتی ہو۔

۱۸۲۵ء کی بات ہے۔ اپریل کی ساتویں تاریخ تھی۔ پورٹ لوئس کے علاقے میں غضب کی بارش ہوئی اور دریا میں کپڑے دھونے والی عورتیں پانی کے ریلے میں بہہ گئیں۔ ان سزا یافتہ مزدوروں سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور وہ عورتوں کی جانیں بچانے کے لئے دریا میں کود پڑے۔ خدا جانے کس کے دل میں یہ نیکی آئی کہ اس نے سرکاری ریکارڈ میں ان مزدوروں کے نام درج کر دیئے۔ ان میں سو کا محمد بھی تھے، ظہیر الدین بھی تھے اور موسیٰ منصور خاں بھی تھے۔

سوچتا ہوں کہ زنجیر پہن کر رقص کیا جائے یا نہ کیا جائے، زنجیر پہننے والے ڈوبتوں کی جانیں بچا کر دریا پار ضرور اتر سکتے ہیں۔

اس واقعے کے بارہ سال بعد کالے پانی کی اس سزا کا سلسلہ موقوف ہوا۔

اسی دوران جزیرے میں نیا ایڈووکیٹ جنرل آیا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ غلامی کا مخالف ہے۔ اس پر گورے آقا بپھر اٹھے۔ ان کے منہ سے جھاگ اڑنے لگے۔ قریب تھا کہ بغاوت ہو جائے۔ بچارے گورنر نے بوکھلا کر ایڈووکیٹ جنرل کو چلتا کیا۔ اگلے برس یعنی ۱۸۳۴ء میں وہ دوبارہ آیا اور دوبارہ نکالا گیا۔ غلاموں کے مالکوں کی آنکھوں کا یہ حال تھا جیسے جزیرے کا ٹھنڈا پڑا ہوا آتش فشاں ان کی آنکھوں میں سما کر دوبارہ جی اٹھا ہو۔

اس کے ایک سال بعد برطانوی پارلیمان نے غلاموں کے بنانے کا قانون منظور کیا۔ یکم فروری کو پوری برطانوی شہنشاہی میں،

غلامی ختم کر دی گئی۔ اس پر ماریشس کے فرانسیسی آقا مچل گئے کہ بھلا کبھی کوئی غلام معاوضے کے بغیر آزاد ہوا ہے۔ انہوں نے جا کر مقدمہ لڑا اور اڑسٹھ ہزار چھ سو تیرہ غلاموں کی رہائی کے عوض تاج دار برطانیہ سے اکیس لاکھ بارہ ہزار چھ سو بتیس پاؤنڈ اور دس شلنگ وصول کئے۔

گردن سے غلامی کا طوق اترنا تھا کہ جزیرہ میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ آزادوں نے پہلا نعرہ یہ لگایا کہ بس بہت ہوا۔ وہ کھیتوں سے نکل کر جو چلے تو افق پار اتر گئے؟ اور پھر کبھی واپس نہیں آئے۔ گنے کی فصل بڑھی، تیار ہوئی اور جہاں کھڑی تھی وہیں ڈھے گئی۔ ماریشس کی ہواؤں میں آقاؤں کے گھونسے لہراتے رہے اور ماریشس کے سناٹوں میں فرانسیسی گالیاں گونجتی رہیں۔ جزیرہ مزدوروں سے خالی ہو گیا۔

شاید خدا سو گیا

ان ہی دنوں بحر ہند کے افق پر وہ جہاز آتا نظر آیا جس پر ہندوستان سے مزدور لائے جا رہے تھے۔ یہ مزدور لکھت پڑھت کر کے لائے گئے تھے۔ اقرار ناموں پر دستخط ہوئے تھے۔ یہ بچارے ان پڑھ محنت کش دستخط کرنا کیا جانیں۔ اس زمانے میں انگوٹھے کا نشان نہیں لگتا تھا بلکہ ان کے ہاتھ میں قلم دے کر صلیب کا نشان بنوایا جاتا تھا۔ سفید آقا خواب دیکھ رہے تھے آج یہ لوگ جو صلیب کا نشان اپنے اقرار نامے پر بنا رہے ہیں، کل کلاں کلیسا کے فرش پر گھٹنے ٹیکے یہ لوگ یہی نشان کبھی اپنے ماتھے پر بنا رہے ہوں گے اور کبھی اپنے سینے پر۔

۱۸۳۴ء میں ہندوستانی جہازی بھائیوں کا پہلا جہاز 'ماریچ' کے ساحل پر لگا۔ اس سال گیارہ سو ساٹھ مرد لائے گئے۔ اکسٹھ عورتیں لائی گئیں۔ بائیس لڑکے اور گیارہ لڑکیاں لائی گئیں۔ ان لوگوں سے پانچ سال کا معاہدہ کیا جاتا تھا۔ ان کی ماہانہ تنخواہ دس روپے تھی جن میں سے پانچ روپے نقد دیئے جاتے تھے۔ باقی رقم کے کپڑے، چاول دال اور گھی دیا جاتا تھا۔

بہت سے لوگ تو معاہدے کے پانچ برس پورے ہوتے ہی لوٹ جاتے۔ بہت سے پھر کبھی واپس نہیں گئے۔ اور یا تو نئے معاہدے کرتے رہے یا دہاڑی پر کام کرنے لگے۔ بعض نے چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے۔ ماریشس کی دو تہائی آبادی ہندوستانی ہو گئی۔

اس کا سبب یہ تھا کہ دنیا میں شکر کی مانگ بڑھنے لگی۔ جوں ہی لندن کی منڈی میں شکر کے دام چڑھتے' کھیتوں کے مالک اپنے ایجنٹوں پر دباؤ ڈالتے کہ ہندوستان سے اور زیادہ مزدور لاؤ۔ کہتے ہیں کہ وہ ایجنٹ گاؤں گاؤں پھیل گئے اور سادہ لوح دیہاتیوں کو بہلا پھسلا کر اور جھوٹے وعدے کر کے انہیں جہازوں پر لادنے لگے۔

ان ہی دنوں ہندوستان میں یہ جملہ مشہور ہوا کہ ماریچ میں پتھر اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے گنی نکلتی ہے۔ پتھر کے نیچے سے گنی تو کیا خاک نکلتی مگر ماریشس کی خاک سے گنا خوب خوب نکلا۔

گورے آقاؤں نے بے کس اور بے بس مزدوروں پر طرح طرح کے ظلم توڑنے شروع کئے۔ سارے اقرار نامے طاق پر دھر دیئے گئے اور سارے وعدے وعیدیں بھلا دیئے گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ شکایتیں اتنی بڑھیں کہ ۱۸۳۷ء میں ہندوستان سے مزدور لانے کا سلسلہ ہی موقوف کر دیا گیا۔

دولت کے اونچے انباروں پر اینڈنے والے مالکان نے محسوس کیا کہ سطح زمین سے ان کا فاصلہ تیزی سے کم ہونے لگا ہے۔ اب تو ہر طرف دوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ اعلان ہوئے' اقرار ہوئے کہ اب

کسی کو ستایا جائے گا نہ تنگ کیا جائے گا۔

مالکوں نے خون چوسنا بند کیا تو یہ کام مچھروں اور پسوؤں نے اپنے ذمے لے لیا۔ مزدوروں کی بستیوں میں وبائیں پھیلنے لگیں۔ ۱۸۵۴ء میں ہیضے کی وبا پھیلی تو ہزاروں کی جان لے کر ٹلی۔ پھر کبھی طاعون نے سر اٹھایا تو کبھی ملیریا کی زد میں آکر پورے جزیرے پر کپکپی طاری ہو گئی۔ الزام ہمیشہ ہندوستانیوں پر لگتا تھا۔ ایک وقت تو ایسا آیا کہ جب کبھی ہندوستان سے آیا ہوا کوئی جہاز ساحل پر لگتا تھا تو بیماری کے خوف سے ماریشس کے باشندے اپنے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں دو جہازوں 'حیدر آبادی' اور 'فتح مبارک' کے ساڑھ چھ سو مسافر دو چھوٹے چھوٹے ویران جزیروں پر اتار دیئے گئے جہاں پینے کا پانی تک نصیب نہ تھا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ جو جراثیم لائے ہوں گے' وہ تو بعد میں مرے ہوں گے' پہلے یہ مزدور مر گئے۔

۱۸۶۶ء میں ماریشس میں ایسا قیامت کا ملیریا پھیلا کہ دو سال تک یہ حال رہا کہ راہ چلتے لوگ گر کر مر جاتے تھے۔ اس وقت کہا جاتا تھا کہ شاید خدا سو گیا ہے۔ سب سے زیادہ موت مزدوروں کو آئی۔ قبریں کھودنے والے رات دن قبریں کھودتے رہتے تھے۔ اکثر لاشیں تنہا آتی تھیں کیونکہ ان کے کنبے والے خود اپنی موت کے انتظار میں کہیں پڑے ہوتے تھے۔ ان دو برسوں کے دوران ۳۲ ہزار آدمی مرے۔

چار سال بعد ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس سے کہا گیا کہ

مزدوروں کی شکایتوں کا جائزہ لے۔ اس نے لیا۔ نہایت شاندار سفارشات مرتب کیں۔ بڑی دھوم سے حکومت کو پیش کی گئیں۔ حکومت نے اتنی ہی دھوم سے ان سفارشات کو کاغذوں کے انبار میں دفن کر دیا۔

بیسویں صدی کا نواں برس تھا جب دوسرا شاہی کمیشن بٹھایا گیا۔ اس نے لمبی چوڑی سفارشیں پیش کرنے کی بجائے سیدھی سی بات کہی کہ ٹھیکے پر مزدور لانے کا سلسلہ موقوف کیا جائے۔ یہ سفارش مان لی گئی البتہ اس پر عمل ہوتے ہوتے تیرہ برس لگے۔

۱۹۲۲ء کے بعد پھر کبھی کوئی جہازی بھائی ماریشس نہیں آیا اور نہ آئندہ کبھی آئے گا کیونکہ کرائے کے ان مزدوروں پر جو ظلم ہوئے وہ لوگوں کو آج تک یاد ہیں۔

فرانسیسی میں بھوجپوری کی ملاوٹ

لندن سے پورٹ لوئس کا سفر کتنا لمبا ہے' اب کیسے بتاؤں۔ بس یوں سمجھئے کہ عمر کے دو دن کم ہو جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ماریشس کی شفاف فضا میں رہنے سے عمر میں دو سال بڑھ جاتے ہوں گے۔

میں جو لندن سے چلا تو ایئر فرانس کے چیک ان کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خاتون نے اول تو بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور پھر یہ مژدہ سنایا کہ انہوں نے لندن سے پیرس تک اور پیرس سے ماریشس تک مجھے ہوائی جہاز میں کھڑکی والی نشست دے دی ہے۔ خود مجھے وہ نشست بالکل زہر لگتی ہے لیکن انہوں نے جس تپاک سے یہ خبر سنائی اس سے مجھے خیال ہوا کہ شاید میرے ساتھ وہ سلوک ہو رہا ہے جسے اپنی طرف وی آئی پی بلکہ وی وی آئی پی والا سلوک کیا جاتا ہے۔

لندن سے پیرس تک چالیس منٹ کا سفر تو بخیر و خوبی کٹ گیا۔ البتہ اس کھڑکی سے جتنی بار بھی باہر دیکھا' طیارے کے پیندے سے لگے لگے بادلوں نے ہر بار منہ چڑا دیا۔ پیرس کے ہوائی اڈے پر چار گھنٹے تک مسلسل فرانسیسی بولیاں سننے کے بعد جب آگے چلنے کی باری

آئی اور مجھے بڑے سے جمبو جیٹ میں کھڑکی والی نشست ملی تو میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ میں نے یہ دعا نہیں مانگی کہ باقی سفر ساتھ خیریت کے گزرے بلکہ یہ التجا کی کہ اچھے مسافروں کے ساتھ گزرے۔

شاید میں وقت دعا تشریح کرنا بھول گیا۔ کسی کلیسا کی دو موٹی موٹی راہبائیں سامان سے لدی پھندی آئیں اور پہلے خود برابر والی دو نشستوں میں دھنسیں اور پھر اپنا فالتو سامان اپنے پیروں تلے ٹھونس ٹھانس کر حفاظتی پٹیاں باندھ لیں اور پھر اپنے موٹے موٹے چشموں کے دریچوں سے مجھے دیکھا اور آواز سے آواز ملا کر بولیں: "بونژو"

بس' یہاں سے ایک طویل سزائے قید کا آغاز ہو گیا۔ اب میرے اپنی نشست سے اٹھ کر باہر نکلنے' ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے اور وہ جو ہوائی اڈے پر چائے پی تھی اسے ٹھکانے لگانے کے تمام راستے مسدود تھے۔ اپنی دوسری دعا میں نے ذرا تفصیل سے مانگی کہ چونکہ سفر بہت طویل ہے اس لئے اب تک میں نے جتنے سیال مادے بدن میں اتارے ہیں وہ وہیں کہیں اندر ہی کھپ جائیں یا پھر جلد کے مساموں کے راستے بھاپ بن کر اڑ جائیں۔ پھر میں نے یہ اہتمام بھی کیا کہ راستے بھر کھانا تو کھایا' پانی نہیں پیا۔

اس بار میری دعا جزوی طور پر قبول ہو گئی لیکن شاید دونوں راہباؤں نے بھی یہی دعا مانگی تھی جو کلی طور پر قبول کرلی گئی۔ سامنے والے ٹائلٹ کی روشن بتی سارے راستے اعلان کرتی رہی کہ ٹائلٹ خالی ہے مگر ان دونوں کو خراٹے لینے سے فرصت ملتی تو وہ روشن بتی کی

دعوت قبول کرتیں۔

اوپر سے غضب یہ ہوا کہ طیارے کی اڑان اتنی اونچی تھی کہ نیچے سارا یورپ گزر گیا اور اس کے دیدار نہ ہو سکے پھر سارا افریقہ آ کر چلا گیا اور میں زیارت سے محروم رہا۔ بس سامنے اسکرین پر ایک نقشہ نظر آتا رہا جس پر اڑتے ہوئے طیارے کی ذرا سی شبیہ یہ بتاتی رہی کہ اب ہم کس علاقے سے گزر رہے ہیں۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہمارا ہوائی جہاز اس مشہور و معروف خط استوا کو پار کرنے والا ہے جس کے بارے میں اسکول کے جغرافیے کا سبق مجھے اب تک یاد تھا۔ وہاں سورج کی کرنیں سال بھر سیدھی پڑتی ہیں اس لیے وہاں موسم نہیں بدلتے بلکہ سال کے بارہ مہینے گرمی رہتی ہے۔

جب اسکرین کے نقشے پر اڑتے اڑتے ہمارا ہوائی جہاز عین خط استوا کے اوپر پہنچا تو میں نے بڑے اشتیاق سے اور تھوڑی سی بے تابی سے باہر دیکھا۔ خدا جانے کیوں یقین تھا کہ نیچے زمین پر سفید چاک سے نقطے دار لکیر کھینچی ہو گی مگر جب اندر چھپے ہوئے شریر لڑکے نے ہنس ہنس کر میرا مذاق اڑایا تو میں خود بھی ہنس پڑا۔ برابر بیٹھی ہوئی خشک سالی کی ماری ہوئی دونوں فربہ راہبائیں بھی ہنسنے لگیں اور مجھ سے کچھ پوچھا مگر ان کی زبان فرانسیسی تھی اور میرا حال یہ تھا کہ فرانسیسی نمی دانم۔

افریقہ کا مشرقی ساحل ختم ہوا اور بحر ہند کا نیلگوں پانی شروع ہوا۔ وہ بھی سپاٹ تھا۔ یہ بھی بے منظر۔ مگر جب طیارے کی رفتار

سمت پڑنی شروع ہوئی اور جب سمندری لہریں نظر آنے لگیں اور جب یہ اعلان ہوا کہ ہمارا طیارہ جزیرہ "سے شلز" میں اترنے والا ہے اس وقت کھڑکی کے قریب بٹھائے جانے کی حکمت سمجھ میں آئی۔

طیارہ نیچے جھکا اور اچانک فیروزی سمندر کے بیچوں بیچ چمکتا ہوا اتنا گہرا سبز ٹاپو دکھائی دینے لگا کہ اہل پاکستان اسے اپنا پرچم سمجھ بیٹھیں تو مجھے تعجب نہ ہو۔ سے شلز کبھی دہکتا ہوا آتش فشاں رہا ہو گا۔ اب وہ سرد پڑا ہوا ایسا جزیرہ نظر آیا جو چین کی سبز چادر تانے سو رہا ہو۔

وہاں سے اڑان بھر کر ہمارا طیارہ تھوڑی دیر بعد فرانسیسی جزیرے ریونین میں اترا۔ یہ بھی سرد پڑا ہوا آتش فشاں تھا جس کا بڑا سا دہانہ آج بھی غار جیسا نظر آ رہا تھا' البتہ اس کے ساحل سرسبز تھے اور وادیاں شاداب تھیں۔ ہمارا طیارہ بھی فرانس کا تھا۔ یہ جزیرہ بھی فرانسیسیوں کا تھا لہٰذا ہمیں' نیچے اترنے کی اجازت ملی اور اب جو بارہ تیرہ گھنٹے سے نشستوں میں پھنسے ہوئے مسافروں نے نیچے اتر کر میدان میں ورزش شروع کی تو یوں لگا کہ جیسے جنگلی ہرن طویل قید سے آزاد کئے گئے ہوں۔

میری آزادی کے احساس کی بات نہ پوچھئے۔ مجھے تو یوں لگا کہ بیسویں صدی کا سنہ سینتالیس ہے' اگست کی یہی کوئی 14 یا 15 تاریخ ہے' اور مجھے استعماریت سے نہیں' رہبانیت سے نجات ملی ہے۔ جی چاہا یسوع مسیح سے چیخ چیخ کر فرانسیسی میں کہوں:

"مغسی مغسی"۔

خوشی اس بات کی نہیں تھی کہ ریونین آگیا بلکہ اس بات کی

تھی کہ ماریشس اب قریب ہے۔

یہاں سے ہمارے طیارے نے ایک جست بھری اور جب ماریشس میں اترنے لگا تو یوں لگا جیسے گنے کے کھیتوں میں اتر رہا ہو۔ طیارہ نیچا ہوا تو خیال ہوا کہ اس کا پیٹ گنے کے پتوں کو چھو رہا ہو گا اور کھیتوں میں لگے ہوئے پتھروں کے انباروں سے لگا لگا اڑ رہا ہو گا۔

ماریشس میں بس ایک ہی ہوائی اڈہ ہے۔ جزیرہ اتنا چھوٹا سا ہے کہ دوسرے کی گنجائش بھی نہیں۔ میں طیارے سے اتر کر ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہوا اور وہاں کے عملے کو دیکھا تو ایک بار تو یوں لگا کہ میں اگر مدراس میں نہیں تو تریوندرم میں ضرور اترا ہوں۔ ملاوٹ سے پاک اتنی خالص آبنوسی صورتیں تو اب خود تامل ناڈو اور کیرالہ میں بھی نہیں ہوں گی۔ ماریشس کے سرد خانے میں وہ اصل شکلیں اور شباہتیں منجمد ہو کر آج تک جوں کی توں محفوظ ہیں۔

ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہوتے ہی جس پہلے بورڈ پر نظر پڑی اس کا مضمون تو اب یاد نہیں لیکن اس کا مفہوم یہ تھا کہ اس جزیرے میں منشیات لانے والوں کی کھال کھنچوا کر اس میں گنے کا پھوک بھر دیا جائے گا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ چلو' ملیشیا کے بعد ایک اور ملک دیکھنے کو ملا جو ہیروئن کی لعنت سے پاک ہے۔ اچھا ہوا' دل ہی دل میں کہا۔ کہیں اونچی آواز سے کہہ دیتا تو محلے کے لڑکے تالیاں بجاتے۔

ہوائی اڈے کے لاوڈ اسپیکروں پر تو سارے اعلان انگریزی اور فرانسیسی میں ہو رہے تھے مگر ہوائی اڈے میں موجود لوگ جو زبان بول

رہے تھے وہ نہ انگریزی تھی نہ فرانسیسی بلکہ وہ فرانسیسی کی کوئی دور کی رشتے دار نکلی۔ وہ کریول تھی۔ افریقی لہجے میں ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی جس میں کہیں کہیں بہار اور مشرقی یو پی کی بھوجپوری شریک تھی۔

میں ہوائی اڈے سے باہر نکلا تو مجھ پر پہلی بار یہ بھید کھلا کہ اردو بولنے والے صورت شکل اور حلئے سے پہچانے جاتے ہیں۔ غالب کی مجلس مذاکرہ کے میزبان مجھے جھٹ پہچان گئے۔ معانقے ہوئے' مصافحے ہوئے۔ خیریتیں پوچھی گئیں' خیریتیں بتائی گئیں اور گرم کوٹ پہنے رکھنے کا مشورہ دیا گیا کیونکہ ماریشس خط استوا کے جنوب میں تھا اور جون جولائی اگست ستمبر میں وہاں جاڑے ہوتے ہیں۔

ہماری کاریں گنے کے کھیتوں کے بیچ دوڑتی دوڑتی میرے ہوٹل پہنچ گئیں۔ راستے میں جب شہر آئے تو کبھی بنگلور یاد آیا کبھی میسور۔ کبھی کانجی ورم یاد آیا اور کبھی تریوندرم۔ لوگوں نے اپنی بولی بدل دی ہے مگر اپنا پہناوا نہیں بدلا۔ ماریشس اس روز چھوٹا سا ہندوستان لگا۔

ہندوستانیوں کی آخری ہار

اگلی صبح میرے احباب مجھے مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ لے گئے۔ خوبصورت پہاڑی کے دامن میں ایک کشادہ میدان کے بیچ اور ایک چھوٹی سی وادی کے کنارے سے مجھے کسی یونیورسٹی کا کیمپس لگا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ، جسے جزیرے والے ایم جی آئی کہتے ہیں، ماریشس میں ہندوستانی ثقافت کے تحفظ اور فروغ کے لئے قائم کیا گیا ہے چنانچہ مجھے یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی کہ یہاں اردو بھی پڑھائی جا رہی تھی، اردو زبان کے اساتذہ کی تربیت بھی ہو رہی تھی اور اب سب سے بڑھ کر یہ کہ پچھلی صدی میں ہندوستان سے آنے والے کھیت مزدوروں کا سارا ریکارڈر بھی یہیں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

میں اسے دیکھنے کے لئے مچل گیا۔

ہم ایک بڑی سی عمارت میں داخل ہوئے۔ اس کی نچلی منزل کے اتنے ہی بڑے ہال میں ایک عجائب گھر تھا۔ جہازی بھائیوں کا عجائب گھر!

سرکاری ریکارڈ آفس کا یہ حصہ عام دیکھنے والوں کے لئے کھلا ہوا تھا۔ وہاں ہندوستان سے لائے جانے والے کھیت مزدوروں کے

لباس، گھر گرہستی اور چوکے رسوئی کا ساز و سامان، یہاں تک کہ ان کی جھونپڑیوں کے قدیم فوٹو تک آراستہ تھے، لیکن سب سے دلچسپ ان لوگوں کے چہروں کی تصویریں تھیں۔ کرخت چہرے، ملائم چہرے، جرائم پیشہ چہرے، معصوم چہرے، اور خرانٹ چہرے اور سب سے بڑھ کر ہندو چہرے اور مسلمان چہرے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چہرے سے دین دھرم صاف پہچانا جاتا تھا۔ مسلمان مردوں کے چہروں پر خوش نما ڈاڑھیاں تھیں اور بال سنوارے ہوئے تھے اور مسلمان عورتوں کے سروں پر پلو ضرور تھا۔

دیوار پر قطار در قطار تصویریں دیکھتے دیکھتے اچانک ایک تصویر پر میری نگاہ پڑی۔ کسی مرد کی تصویر تھی اور اس کی گردن میں ایک ڈوری بندھی ہوئی تھی، جس میں ٹین کی بنی ہوئی ڈھکنے دار نلکی سی پڑی تھی۔

"یہ کیا ہے، یہ کیا ہے؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

میری میزبان نے بتایا کہ اس میں مزدور کے سارے شناختی کاغذات بند کر کے اور اچھی طرح ڈھکن چڑھا کر اسے مزدور کے گلے میں ڈال دیا جاتا تھا اور اسے حکم تھا کہ اس نلکی کو سوتے جاگتے، جیتے مرتے، کسی بھی حالت میں ایک لمحے کو بھی اپنے تن سے جدا نہ کرے۔

"کیوں؟"

میرے اس سوال ہی سے ظلم کی داستان شروع ہوتی ہے۔

گنے کے کھیتوں میں ان ہندوستانی مزدوروں کی صبح دن نکلنے سے

شام سورج ڈوبنے تک کام کرنا ہوتا تھا' ان کے کھانے میں غذائیت نام کو نہ تھی اور ان کے جو کیمپ تھے' جن میں سے کچھ کے کھنڈر آج تک باقی ہیں' کسی قید خانے اور کال کوٹھری سے بہتر نہ تھے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ تازہ ہوا اندر نہ آنے پائے اور غلاظت باہر نہ جانے پائے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ آئے دن بیمار پڑتے تھے۔ ان کا کام سے غیر حاضر ہونا غضب تھا۔ ایک دن کی غیر حاضری پر دو دن کے پیسے کاٹے جاتے تھے اور اگر کوئی مزدور چھ دن سے زیادہ غیر حاضر ہو جائے تو قیامت تھی۔

اگر شامت کا مارا کوئی مزدور اپنے آقا کی شکایت کرنے دارالحکومت چلا جاتا تو سب سے پہلے اسے قید خانے ڈال دیا جاتا تھا' جہاں اسے اپنے آقا کے آنے تک رہنا پڑتا تھا۔ کسی کتاب میں لکھا ہے کہ گورا آقا آتا تو مجسٹریٹ صاحب بہادر اس کی پوری کتھا سنتے تھے اور مزدور کی بپتا یوں بھی کیسے سنتے کیونکہ وہ غریب بھوجپوری بولتا تھا یا پھر تامل یا مرہٹی۔ کتاب میں لکھا ہے کہ مظلوم اپنی بات کیے جاتا تھا اور کوئی اہل کار ایسا بھی نہ تھا جو مجسٹریٹ کو اس کی بات کا مطلب سمجھا دے۔

آخر گورا آقا ہی سرخرو ہوتا تھا۔

تقسیم ہند سے پوری ایک صدی پہلے جزیرہ ماریشس میں جہازی بھائیوں پر یہ ظلم اور استبداد کا دو دھاری نظام مسلط کیا گیا۔ اس نظام کو وہ کہتے بھی تھے۔ "ڈبل کٹ سسٹم۔" اس میں یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی مزدور کسی مہینے میں چھ دن سے زیادہ غیر حاضر ہو جائے تو وہ پورا مہینہ

اس کی مشقت کے روزنامچے سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا تھا۔ اب اسے اپنے تحریری معاہدے کی تکمیل کے لئے پانچ سال پورے ہونے کے بعد اس ایک مہینے کا خسارہ پورا کرنا پڑتا تھا۔

بیس سال بعد ۱۸۶۷ء میں اور غضب ہوا۔ اس برس ایک نیا مزدور قانون لاگو ہوا۔ اور پولیس کو حکم دیا گیا کہ لوگوں کو مار مار کر اس قانون پر عمل کرائے۔ اس قانون کے تحت ہر کالے مزدور کے لئے لازمی تھا کہ جب بھی طلب کیا جائے۔ وہ چوں چرا کے بغیر اپنا شناختی کارڈ پیش کرے جس پر اس کا فوٹو لگا ہوتا تھا' اور وہ پاس پیش کرے جو پولیس جاری کیا کرتی تھی۔ سبب اس قانون کے نفاذ کا یہ بتایا گیا کہ لوگ آوارہ ہو جاتے ہیں' کام سے بھاگ جاتے ہیں اور چور ڈاکو بن جاتے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ مزدوروں کے معاہدوں کی میعاد پوری ہونے لگی تھی اور وہ کام چھوڑ چھوڑ کر جانے لگے تھے۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ وہ گڑگڑائیں' خوشامدیں کریں۔ پیروں پڑیں اور پانچ سال کی مشقت کا نیا معاہدہ کریں۔

کبھی تو یہ کہ ان کے کاغذات کھو جاتے تھے اور کبھی یہ کہ یہ لوگ فوٹو اتروانے اور فارم بھروانے کی قیمت کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ پولیس ایسے لوگوں کو خونخوار شکاری کتوں کی طرح ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ ایسے لوگوں کے لئے خاص کانجی ہاؤس بنایا گیا تھا جس میں انہیں قید کیا جاتا تھا۔ کوڑے مارے جاتے تھے اور کوٹھریوں میں جھونک دیا جاتا تھا۔

یہ لوگ جاہل ہوتے تھے اور فرانسیسی تو کیا' غلاموں کی بولی

کریول بھی نہیں بول پاتے تھے چنانچہ پہلے ان کا بدن ٹوٹتا تھا اور پھر پوری شخصیت کا شیرازہ بکھر جایا کرتا تھا۔

کہتے ہیں کہ صرف ایک برس میں بارہ ہزار افراد پکڑے گئے اور نو ہزار کو آوارہ گردی کا مجرم قرار دیا گیا۔

ظلم اتنا بڑھا اور اس بدنام قانون کے قصیے نے ایسا سر ابھارا کہ خود گورے بھی چلا اٹھے۔ کھیتوں کے ایک سفید فام مالک نے تو دوسرے آقاؤں کے غیض و غضب کی پروا کئے بغیر ایک لمبی چوڑی عرض داشت لکھی جس پر اس نے چار ہزار سے زیادہ ہندوستانیوں کے دستخط کرائے اور اس کے ساتھ خود ایک کتابچہ بھی لکھا۔ اس عرضی اور کتابچے کی نقلیں ہندوستان اور انگلستان تک جا پہنچیں۔ بالآخر انگریز گورنر نے ۱۸۷۲ء میں ایک شاہی کمیشن بٹھایا تاکہ وہ سارے معاملے کی چھان بین کرے۔

بعد میں اس کی رپورٹ جاری ہوئی۔ رپورٹ کیا ہے' مرثیہ ہے۔

جنوبی افریقہ میں گوروں کی حکمرانی کے خلاف جدوجہد کر کے شہرت پانے والا ایک ہندوستانی قانون دان موہن داس کرم چند گاندھی سمندری جہاز نوشہرہ پر جنوبی افریقہ سے ہندوستان جاتے ہوئے ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو ماریشس میں رکا۔ ہندوستانی باشندوں نے گاندھی جی کو کاندھوں پر اٹھا لیا۔ گاندھی جی خود لکھتے ہیں کہ وہ ماریشس میں اپنے کچھ مسلمان دوستوں کے ساتھ رہے۔ انہیں سب سے بڑا استقبالیہ جزیرے کے مسلمانوں نے پورٹ لوئس کے طاہر باغ میں دیا جہاں

ایک مسلم دانشور عبدالقادر نے ہندوستانی باشندوں کی جانب سے سپاسنامہ پیش کیا۔ عبدالقادر کی باتوں سے گاندھی جی بہت متاثر ہوئے اور اپنی تقریر میں انہوں نے ہندوستانیوں کو مشورہ دیا کہ وہ سیاست میں حصہ لیں۔ کیونکہ صرف اسی طرح وہ اپنی سماجی اور اقتصادی حالت بہتر بنا سکتے ہیں۔

گاندھی جی کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ اگلے ہی مہینے جب بلدیہ کے انتخابات ہوئے تو ان میں پہلی بار ایک مسلمان امیدوار کھڑا ہوا۔ اگرچہ وہ ہار گیا مگر ایک بات کا خیال رہے۔

ہندوستانیوں کی وہ آخری ہار تھی۔

ہاں تو بات مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے ریکارڈ آفس کی ہو رہی تھی۔

وہیں میری ملاقات، مرنیا کارٹر سے ہوتی۔ مرنیا تاریخ دان ہیں۔ ان کا تعلق لندن یونیورسٹی سے ہے اور بہت عرصہ سے اس انسٹی ٹیوٹ میں تحقیق کر رہی ہیں۔ میں جو گیا تو انہوں نے پورا دفتر خانہ میرے لئے کھول دیا اور الماریوں سے نکال کر ایک ایک رجسٹر مجھے دکھانے لگیں۔ جہازوں سے اترنے والوں کا اندراج الگ تھا۔ انہیں جاری ہونے والے کاغذات کے رجسٹر' ان کے جینے مرنے کے رجسٹر۔ ان کے خطوط' ان کی درخواستیں' ان کی شکایتیں یہ سب وہاں محفوظ تھیں۔

میں جہازوں سے اترنے والے جہازی بھائیوں کے اندراج کے رجسٹر دیکھنا چاہتا تھا۔ ہر شخص کی حیرت انگیز تفصیل لکھی گئی تھی۔

اسے ہندوستان میں ملنے والا شناختی نمبر —— پھر ماریشس میں ملنے والا نمبر (جو مرتے دم تک اس کے گلے میں پڑا رہتا تھا)۔ اس کے بعد اس کا نام۔ پھر عمر۔ اس کے بعد ذات۔ پھر قدو قامت اور کاٹھی۔ پھر شناختی نشان۔ اس کے بعد ماں یا باپ کا نام' آخر میں گاؤں اور ضلع کا نام۔ بعد میں اس کے اوپر سرخ پنسل سے لکھی ہوئی اس کی مرنے کی تاریخ۔

اس رجسٹر نے آنکھیں کھول دیں۔ ہندوستان میں ذات پات کے تصور کی جیسی تصویر میں نے اس روز دیکھی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہر صفحے پر بائیس مزدوروں کا اندراج ہوتا تھا جن میں تین یا چار مسلمان ہوتے تھے۔ مسلمان مزدور کی ذات کے خانے میں صرف ایک لفظ ہوتا تھا: مسلمان۔ لیکن ہندوؤں کے ناموں کے آگے ذات کے خانے میں راجپوت اور چمار بھرے پڑے تھے۔ ان کے علاوہ بے شمار لوہار' تیلی' حجام' گھوسی' دھوبی' بنئے اور کمہار دکھائی دیئے۔ جتنے راجپوت تھے ان سب کے قدو قامت کے خانے میں "اونچا قد" لکھا تھا۔ چمار سارے کے سارے پستہ قد تھے۔ اس طرح مسلمان زیادہ تر درمیانہ قد کے تھے۔ اکثر کے چہرے پر زخم کے نشان یا نمایاں تل تھے۔ کوئی غازی پور سے آیا تھا۔ کوئی گیا سے' کوئی پورنیا سے کوئی چھپرا سے۔ کوئی آرہ اور کوئی ہزاری باغ سے۔ میں نے اپنے ایک میزبان سے پوچھا کہ ماریشس میں ان لوگوں کی جو اولادیں آباد ہیں ان کی ذات پات کا حال تو کسی سے چھپا ہوا نہ ہو گا۔

کہنے لگے۔ "ہاں۔"

میں نے کہا کہ کیا سب جانتے ہیں کہ کون ذات کا چمار ہے؟

وہ بولے۔ "جی ہاں۔"

میں نے کہا کہ کوئی برا نہیں مانتا؟

انہوں نے کہا۔ "نہیں۔"

اتنے مختصر جوابوں کے بعد حال کھلا کہ جزیرے کی سیاست میں اس ذات پات کا دخل آج تک ہے اور لوگ قانون ساز اسمبلی پر نگاہ رکھتے ہیں کہ اس میں کتنے چمار منتخب ہوئے ہیں' کتنے راجپوت' کتنے تیلی اور کتنے حجام۔

اس کے بعد مرنیا کارٹر نے مجھے وہ رجسٹر دکھائے جن کے ورقوں پر جہاز سے اترنے والے مزدوروں' ان کی بیویوں اور بچوں کی تصویریں بھی چسپاں کی جاتی تھیں۔

یہ تصویریں اتارنے کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب جزیرے میں کیمرہ آیا اور مزدور مشقت سے بھاگ کر جنگلوں اور دوسری آبادیوں میں چھپنے لگے۔ مگر وہ کمال کا کیمرہ تھا۔ اس میں تصویر شیشے کی پلیٹ پر اتاری جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ فوٹو گرافر ہر روز اسی سے سو تک تصویریں اتارتا تھا۔ ہر تصویر کے پیچھے مزدور کا نمبر درج ہوتا تھا۔

وہ چہرے' ان پر عکس بن کر ابھرتے ہوئے اندر کے جذبات' ان پر وہ جا بجا شکنیں' سب کا سینہ آگے کو نکلا ہوا۔ سب کی گردنیں ذرا ذرا سی تنی ہوئی۔ مسکراہٹ ہونٹوں سے کوسوں دور' آنکھیں جیسے افق پر جمی ہوئی اور ان بجھی ہوئی آنکھوں میں فوٹو گرافر کی مصنوعی

روشنی کے دو چمکتے ہوئے نقطے۔

مرنیا نے مجھے ہندوستان سے آنے والی عورتوں کی تصویریں خاص طور پر دکھائیں۔ "یہ دیکھو' یہ ہندو عورتیں ہیں اور یہ جن کے سروں پر آنچل پڑے ہوتے ہیں یہ سب مسلمان ہیں۔"

مرنیا کو تو غالباً ان سب کے نام اور زندگی کے حالات تک یاد تھے کیونکہ انہوں نے جہازوں میں بھربھر کر آنے والی عورتوں کے بارے میں بڑی تحقیق کے بعد ایک کتاب لکھی ہے "لکشمی کی داستان۔" یہ دراصل ان عورتوں کی داستانیں ہیں جو ماریشس میں غلامی کے خاتمہ کے بعد اور غلاموں کے چلے جانے کے بعد گھریلو خادماؤں کے طور پر لائی گئی تھیں۔ یہ سلسلہ ۱۸۴۳ء سے شروع ہوا تھا۔

میں خود تو ان رجسٹروں میں کھو گیا اور اپنے جن میزبانوں سے کہا تھا کہ وہ مجھے ایک گھنٹے بعد آکر لے جائیں وہ واقعی ایک گھنٹے بعد آ گئے۔ یہاں تو ایک دن بھی ناکافی تھا۔ میں دوبارہ آنے کا قصد کر کے لوٹ آیا لیکن وہ دوبارہ پھر کبھی نہ آسکی۔

ریڈیو اور پالک کا ساگ

صبح اٹھ کر میں نے زور کی انگڑائی لی۔ ٹیلی فون کر کے چائے کا آرڈر دینا چاہا ——— ادھر سے کسی کی آواز آئی "اوئی"۔ میں نے کہا کہ معاف کیجئے، میں نے صبح صبح زحمت دی۔ ذرا میرے لئے اچھی سی گرم چائے لے آیئے۔ پھر وہی آواز آئی "ویس سر۔"

فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں وہی فرق ہے جو عورت اور کم عورت میں ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میں مسکرا دیا اور ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کھول دیا۔ اور اب جو آواز آئی تو میں پتھرا کر رہ گیا۔ کوئی اناؤنسر املاء لکھوانے کی رفتار سے بول رہا تھا۔ "پلین دے پاپائی کے شیو کمار بودھن ---- پلین دے پاپائی کے شیو کمار بودھن کا دیہانت ہو گیا ہے --- ان کی ارتھی روی وار کو پانچ بجے --- روی وار کو پانچ بجے واسکوڈی گاما اسٹریٹ سے --- واسکوڈی گاما اسٹریٹ سے اٹھائی جائے گی اور شاہ دے مارس میں چھ بجے ---- شاں دے مارس میں چھے بجے ان کا کریا کرم ہو گا۔ کیور پیپ میں ڈیڑھ سال کے بے بی راجندر گتو ---- ڈیڑھ سال کے بے بی راجندر گتو کا دیہانت ہو گیا ہے --- دیہانت ہو گیا ہے --- بے بی راجندر گتو کی ارتھی --- ارتھی ارتھی

---- کریا کرم ---- شمشان بھومی ---- شمشان بھومی۔
اور اس سے پہلے کہ ریڈیو کے لاؤڈ سپیکر سے دھواں نکلنا شروع ہوتا، بیرا چائے لے کر آ گیا اور بولا "چائے پیالی میں انڈیل دوں؟"

"نہیں۔" میرے پتھرائے ہوئے وجود کے اندر سے آواز نکلی ——— "ریڈیو بند کرو۔"

وہ بولا ——— "اوئی"

ماریشس میں جو بہت سے لاجواب کام ہوتے ہیں ان میں وہاں ریڈیو اور ٹیلیویژن کی نشریات بھی ہیں۔ ریڈیو چوبیس گھنٹے جاری رہتا ہے اور بہت سنا جاتا ہے۔ گھروں میں، دکانوں میں اور چلتی ہوئی کاروں میں ریڈیو کی آواز اکثر سنائی دیتی ہے اور کسی موڑ پر طلعت محمود کی غزل، کسی چوراہے میں محمد رفیع کا گیت اور کسی گلی میں گیتا دت کا بھجن یا لتا منگیشکر کا نغمہ سنائی دے جائے تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔

ماریشس ریڈیو کے دو چینل ہیں جن میں سے ایک چینل پر صرف ایشیائی، بلکہ یوں کہئے کہ برصغیر کی زبانوں کے پروگرام جاری رہتے ہیں۔ ان میں ہر روز ایک گھنٹے کا اردو پروگرام ہوتا ہے۔ پھر رات کو بیس منٹ کا پروگرام نشر کیا جاتا ہے جمعہ کو پورٹ لوئس کی جامع مسجد کے امام صاحب کی تقریر ہاتھ کے ہاتھ نشر ہوتی ہے اور یہ تقریر ہمیشہ اردو میں ہوتی ہے۔

یہی حال ٹیلیویژن کا ہے۔ ہندوستانی فلمیں تو خیر اکثر دکھائی جاتی ہیں لیکن پاکستان ٹیلیویژن کے ڈرامے بھی باقاعدگی سے نشر ہوتے ہیں،

اور اپنی نفاست کی وجہ سے بے شمار گھروں میں دیکھے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک خود ماریشس سے تیار کئے جانے والے اردو ڈرامے بھی دکھائے جاتے تھے لیکن وہ سلسلہ اب موقوف ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ماریشس میں ڈرامے اور اداکاری کا چلن بہت ہے۔ اکثر ڈراما فیسٹیول ہوتے ہیں، ڈراما نویسی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ جن دنوں میں وہاں گیا، کچھ روز پہلے اردو ڈراموں کا ہفتہ منایا گیا تھا۔ اس میں حصہ لینے والے نوجوانوں کو اپنے مکالمے ابھی تک یاد تھے چنانچہ ایک روز میری فرمائش پر انہوں نے جھٹ اپنا اسٹیج بنایا اور چھوٹا سا ڈراما پیش کر کے دکھا دیا۔ نو عمر اداکاروں کے منہ سے ماریشس کے مخصوص لہجے میں اردو مکالمے اس روز بہت بھلے لگے۔

غالب سیمینار کے نام پر کچھ اردو بولنے والے حضرات جزیرے میں آئے تو مقامی ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ ایک صبح انہوں نے ہمیں ریڈیو کے اردو پروگرام میں شامل کیا اور غالب اور اردو ادب کے بارے میں کافی گاڑھے سوال کئے۔ ظاہر ہے کہ میرے سوا سب اردو کے اعلیٰ اساتذہ تھے لہٰذا جواب بھی اتنے ہی گاڑھے دیئے گئے۔ دو روز بعد پھر ایسا ہی سلسلہ شروع ہوا اور غالب کے اسلوب اور اقبال کے آئیڈیل اور جدید نثری نظم اور افسانے میں تجریدیت کے تجربے کی باتیں ہونے لگیں۔ بیچ میں غالب کی غزل کا گراموفون ریکارڈ لگا تو میں نے پروگرام کے پروڈیوسر سے کہا کہ خدا کے لئے کچھ سننے والوں پر بھی ترس کھایئے اور کچھ ہلکی پھلکی باتیں بھی کیجئے۔ مثال کے طور پر ہم سے پوچھئے کہ ماریشس ہمیں کیسا

لگا؟ پروڈیوسر نے موقع غنیمت جانا اور مجھ سے کہا کہ باقی ماندہ پروگرام آپ سنبھال لیجئے۔ ریڈیو والا کیا چاہے' ایک مائیکروفون جسے سنبھالنے میں بس ایک لمحہ لگا اور پھر باقی پروگرام کے دوران کبھی علی گڑھ کے پروفیسر نعیم احمد نے شگفتہ گفتگو کی' کبھی لکھنؤ کے پروفیسر محمود الحسن نے شگوفے کھلائے اور حیدر آباد کے ڈاکٹر یوسف سرمست نے تھوڑا سا تو پروگرام کے دوران ہنسایا اور بہت سا پروگرام کے بعد۔

میں واپس ہوٹل پہنچا تو افسر استقبالیہ نے بڑی گرم جوشی سے بتایا کہ پروگرام کے آخری پندرہ منٹ بہت دلچسپ تھے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ تم اردو سمجھتے ہو؟ ——

جواب ملا۔ "نہیں۔"

ماریشس کے ٹیلی ویژن نے اپنے خبرنامے میں غالب سیمینار کی رپورٹ پیش کی۔ پھر نعیم احمد صاحب' محمود الحسن صاحب اور یوسف سرمست صاحب سے غالب کے موضوع پر گفتگو نشر کی اور آخر میں مجھ سے کچھ ہلکی پھلکی اور لطیف بات چیت کی فرمائش کی۔ فرمائش پوری کرنے کی جیسی خوشی اس روز ہوئی' شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔

اب تو بہت سے اردو بولنے والے نوجوان ماریشس براڈ کاسٹنگ کارپوریشن سے وابستہ ہیں جسے وہ ایم بی سی کہتے ہیں۔ ایک رات کسی کا فون آیا اور مجھے بتایا گیا کہ وہ صاحب ایم بی سی سے بول رہے ہیں۔ میں تمام وقت یہ سمجھتا رہا کہ وہ امیسی سے بول رہے ہیں۔

ان نوجوانوں میں ولولہ غضب کا ہے۔ بہت جی لگا کر پروگرام

پیش کرتے ہیں مگر کبھی کبھی دبے دبے لفظوں میں شکایت بھی کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اردو کو بہت کم وقت دیا جاتا ہے اور یہ کہ ادھر ایک شخص نے اچھا پروگرام شروع کیا' ادھر اس کے خیر خواہوں نے اس کے خلاف دفترِ شکایت کھول دیا۔ بعض اچھے براڈ کاسٹر بدل دیئے گئے۔ بعض مقبول پروگرام بند کر دیئے گئے۔

ایک پروگرام جو یقیناً بہت مقبول ہو گا ہمیں ہر صبح سننے کو ملتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ جو کار ہمیں روز جلسہ گاہ لے جاتی تھی' سارے راستے اس میں ریڈیو بجتا رہتا تھا اور اُسی وقت اس پر مفید مشوروں اور ماہرانہ رائے کا پروگرام نشر ہوتا تھا؛ کچھ اردو میں' کچھ ہندی اور کبھی بھوجپوری میں۔ مثلاً پہلے روز پروگرام میں ایک ڈاکٹر صاحب بلائے گئے تھے جو دیر تک شکر کے فائدوں اور نقصان پر روشنی ڈالتے رہے۔ سننے والے ٹیلی فون پر ان سے سوال پوچھ رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب نہایت صبر و تحمل سے جواب دے رہے تھے۔ ماریشس تو یوں بھی گنے کے رس میں گھٹنوں گھٹنوں ڈوبا ہوا ہے۔ اس روز شکر کے بارے میں ہمارے علم میں مٹھاس گھُل گئی۔

اگلے روز پالک کے ساگ پر گفتگو ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے بڑے پتے کی باتیں بتائیں۔ اس شام کی ضیافت میں ہم نے اصرار کر کے پالک کا ساگ پکوایا۔

تیسرے دن شراب کا موضوع زیرِ بحث آیا۔ اس روز ٹیلی فون پر سوال کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ اکثر لوگ بھوجپوری بول رہے تھے جس میں صرف ایک بات ہماری سمجھ میں آسکی کہ شراب پی کر

مردوں کو چپ لگ جاتی ہے اور عورتیں اور زیادہ بولنے لگتی ہیں۔
ہمیں تو صرف زیادہ کا تجربہ ہے۔ یہ اور زیادہ کیسا ہوتا ہوگا۔

چوتھی صبح جب ڈرائیور نے ریڈیو کھولا تو غضب کی بحث ہو رہی تھی۔ گفتگو یہ تھی کہ ساس بہو کے جھگڑوں کا کبھی کوئی حل نکلے گا یا نہیں۔ ان چار دنوں میں ہماری بھوج پوری چونکہ کافی بہتر ہو گئی تھی اس لئے یہ بات بخوبی سمجھ میں آگئی کہ ہر ساس کبھی خود بھی بہو رہ چکی ہے اس لئے جب آگے چل کر وہ خود ساس بنتی ہے تو سارے پرانے حساب بے باک کرتی ہے۔

ایک روز ایم بی سی سے شوکت تھانوی کا مزاحیہ ڈراما سنا جو اردو میں تھا۔ ایک روز آل انڈیا ریڈیو کا ایک ہندی ڈراما سنا۔ وہ بھی اردو میں تھا۔

ماریشس اب دنیا میں ایسا خطہ بچا ہے جہاں اردو اور ہندی کو ملا کر ایک تیسری سہل زبان وضع کی جا سکتی ہے۔ جسے انگریز نے کبھی ہندوستانی کا نام دیا تھا۔ لیکن پھر سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ مشکل ہے۔

اردو کے گیسو، ماریشس کا شانہ

ایک روز نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا۔ "صابر نے کہا "یہ کشمیر کا کیا مسئلہ ہے۔" عظیم نے کہا۔ "ہمیں بھی سمجھایئے۔"

میں سمجھانے لگا کہ کشمیر پاکستان سے کس طرح جڑا ہوا ہے۔ سیالکوٹ سے جموں تک ریل گاڑی چلتی تھی اور راولپنڈی سے سری نگر تک تانگہ جاتا تھا۔

اچانک ایک لڑکا بولا ——— "تانگہ کیا ہوتا ہے؟"

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ان کے بزرگ ڈیڑھ سو سال پہلے ہندوستان سے آئے اور پھر کبھی واپس نہیں گئے۔ میں جتنے دن ماریشس میں رہا ہر ایک سے پوچھتا پھرا کہ کبھی ہندوستان پاکستان جانا ہوتا ہے۔ چند طالب علموں کے سوا سب نے نفی میں جواب دیا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اردو کو اب تک زندہ رکھا ہے۔

ایک روز درسی کتابیں اور نصاب مرتب کرنے والے سرکاری ادارے میں ایک نشست ہوئی۔ دور دور سے اردو پڑھانے والے استاد وہاں آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ لکھنؤ، حیدر آباد اور علی گڑھ کی

یونیورسٹیوں کے اردو کے اعلیٰ ترین اساتذہ کے خیالات سننا چاہتے تھے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ولی دکنی کا انتخاب کیسے پڑھایا جائے۔ فسانہ آزاد پڑھانے سے طالب علموں کو کتنا فائدہ ہو گا۔ مثنوی گلزار نسیم کا مطالعہ کتنا مفید ہو گا اور ہاں اگر میرامن کی باغ و بہار بھی پڑھا دی جائے تو کیا مضائقہ۔

آخر میں میری باری آئی۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ ماریشس میں اردو کی تعلیم کیسے ہو؟ یہ سوال سن کر میری نگاہوں میں اردو بولنے والے اس جوان کی صورت گھومنے لگی جس نے پوچھا تھا کہ تانگہ کیا ہوتا ہے میں نے کہا کہ میں استاد نہیں ہوں، تعلیم و تدریس کا مجھے کوئی تجربہ نہیں البتہ طالب علم ہونے کا مجھے نہ صرف تجربہ ہے بلکہ دو روز پہلے مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ میں اردو کی ایک جماعت دیکھ چکا ہوں اور نوعمر طالب علموں سے باتیں کر چکا ہوں۔ میں نے کہا کہ اس تجربے کی بنا پر ذرا دیر کے لئے مجھے ماریشس کا ایک طالب علم تصور کر لیجئے۔ میں نے کہا:

"میرا نام فاروق بندو ہے۔ میری عمر 14 سال ہے۔ میرے دادا کے دادا ۱۸۵۸ء میں انگریزوں کے ظلم سے بچنے کے لئے جہاز میں بیٹھ کر پٹنہ سے ماریشس آئے تھے۔ اس کے بعد میرے خاندان کا ایک بچہ تک ہندوستان نہیں گیا۔ مجھے پتہ نہیں یہ رتن ناتھ سرشار کون ہیں اور میاں آزاد کا باورچی ٹولے سے کیا تعلق ہے۔ نہ مجھے پنڈت دیا شنکر نسیم کی ثقافت کا علم ہے نہ ولی دکنی کی عجیب و غریب زبان کا۔ تاج محل کی میں نے صرف تصویریں دیکھی ہیں لیکن اس سے مجھے

کوئی جذباتی لگاؤ نہیں اور لال قلعے اور گولکنڈہ سے تو میرا کوئی بھی تعلق نہیں۔

مگر آپ لوگ ہیں کہ میرے پیچھے پڑے ہیں کہ یہی اجنبی اور عجیب چیزیں پڑھوں۔ آپ مجھے ماریشس کے غلاموں کی کہانی کیوں نہیں پڑھاتے کہ وہ کیسے آزاد کئے گئے۔ آپ مجھے ہندوستان سے جہازوں میں بھر بھر کر لائے جانے والے مزدوروں کا ناول کیوں نہیں پڑھاتے۔ آپ مجھے قاسم ہیرا کی غزلیں اور عنایت حسین عیدن کے ایک بابی ڈرامے کیوں نہیں پڑھاتے، محمد حنیف کنہائی کی لکھی ہوئی مختصر کہانیاں پڑھایئے، ماریشس کے ان پرندوں کی داستان پڑھایئے جنہیں یورپی آباد کار بھون کر کھا گئے اور اب وہ ناپید ہیں۔ مجھے وہ اردو نہ پڑھایئے جس میں دکنی کی آمیزش ہے۔ مجھے وہ اردو پڑھایئے جس میں بھوجپوری کا رنگ شامل ہے۔"

میری اس تقریر پر بہت بحث ہوئی۔ میں مسرور ہوا کیونکہ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ لیکچر نہ ہو، بحث ہو۔

ماریشس والوں کو اس بات کا بڑی شدت سے احساس ہے کہ ان کی اردو دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد کی اردو جیسی نہیں۔ نثر اور نظم کی اپنی جتنی کتابیں چھاپتے ہیں یا اردو کے جو رسالے نکالتے ہیں ان کے پیش لفظ میں اس بات پر معذرت کرتے نظر آتے ہیں کہ معاف کیجئے ہماری زبان میں وہ شمالی ہند جیسی خوبیاں نہیں۔

اب انہیں کون سمجھائے کہ جس زبان میں مقامی رنگ سمونے کی لچک نہ ہو وہ سوکھی شاخ کی طرح تڑاخ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

زبان کے معاملے میں ماریشس ایک بہت بڑی تجربہ گاہ ہے۔ زبانیں کیسے جیتی ہیں، کیسے مرتی ہیں اور کس طرح اپنے روپ بدلتی ہیں اس کا بھرپور مظاہرہ ماریشس میں ہوا ہے۔

یہ جزیرہ پہلے پہل اس تختی کی مانند تھا کہ جس پر نہ ملتانی مٹی پوتی گئی تھی نہ سیاہی کا ڈوبا لے کر قلم چلایا گیا تھا۔ اس جزیرے میں پہلے پہل کوئی نہیں رہتا تھا۔

سب سے پہلے عرب آئے اور چلے گئے۔ ان کے بعد پرتگالی آئے مگر ان کا دل نہیں لگا۔ پھر ولندیزی آئے اور زمینوں سے فصلیں اگانے کے لئے جاوا، ملایا، ہندوستان اور افریقہ سے غلام لائے —— ایک دنیا جانتی ہے کہ اس وقت قبضہ کرنے والی گوری قوموں میں یہی ولندیزی سب سے زیادہ ظالم تھے۔ انہوں نے غلاموں کو اس طرح رکھا ہو گا کہ وہ آپس میں مل نہ سکے اور ماریشس کی کوئی اپنی زبان وضع نہ ہو سکی۔

پھر فرانس والے پہنچے اور انہوں نے جزیرے کو باضابطہ کالونی بنا کر غلاموں سے کام لینا شروع کیا اور غالباً پہلی بار فرانسیسی آقاؤں اور سیاہ فام افریقی خادموں کے درمیان مکالمہ ہوا۔ وہی زمانہ تھا جب پھیلی ہوئی چپٹی ناکوں اور موٹے موٹے ہونٹوں والے غلاموں نے آقاؤں کی فرانسیسی بولی بولنے کی کوشش کی۔ وہ جو زبان وجود میں آئی، جسے کریول یا لنگڑی لولی فرنچ کہتے ہیں، بس وہی ماریشس کی زبان بن گئی۔

پھر جب ہندوستان کی بندرگاہوں سے بھر بھر کر جہاز آنے لگے، کوئی تامل بولتا ہوا آیا، کوئی بھوجپوری، کسی کی زبان مرہٹی تھی اور کسی

کی شستہ اردو، کچھ لوگ ملیالم بول رہے تھے اور کچھ بنگالی، اس وقت زبان سازی کی قدرتی مشین میں حرکت شروع ہوئی۔ وقت نے، حالات نے، تقاضوں نے اور احتیاج نے رابطے کی زبان تراشنے کا عمل شروع کیا اور جیسے برف بنانے کی مشین سے بالآخر بڑی سی سلّی بن کر نکلتی ہے اور پھسلتی ہوئی دور تک چلی جاتی ہے، اس طرح زبان سازی کی اس تجربہ گاہ سے وہی پھیلی ہوئی چپٹی ناکوں اور موٹے موٹے ہونٹوں والے غلاموں کی زخم خوردہ کریول نکلی جس کے زخموں پر بھوجپوری کے پھاہے رکھے تھے۔ وہی آج تک ماریشس کی زبان ہے۔ بچہ کریول ہی میں دودھ مانگتا ہے، مولوی صاحب نماز جمعہ کا خطبہ کریول ہی میں دیتے ہیں۔ میں یہ پوچھنا بھول گیا کہ مردے کو قبر میں لٹا کر تلقین کس زبان میں کی جاتی ہے۔

بات مسلمانوں تک جا پہنچی ہے تو یاد آیا کہ ان کی کہانی بہت ہی دلچسپ ہے۔

عربوں نے تو یہاں اپنا کوئی نشان تک نہ چھوڑا۔ کہتے ہیں کہ ۱۷۲۲ء میں یعنی فرانسیسی دور میں ہندوستان سے پہلے پہل مسلمان ماریشس میں آباد ہوئے۔ دو سال بعد کسی علی خان نے گورنر کے نام درخواست لکھی جو تاریخ میں محفوظ ہے۔ وہ ملتمس ہوا تھا کہ حضور، فیض گنجور اگر اس کی بیوی کو غلامی سے آزاد کر دیں تو تاحیات دعائے خیر کرے گا۔

تاریخ میں ایک اور دلچسپ بات محفوظ ہے اور وہ یہ کوئی پچاس سال بعد ماریشس میں ہندوستانی نسل کے بارہ مسلمان بچے پیدا

ہوئے۔ کسی کا نام صابر تھا، کسی کا عظیم۔ کوئی بابو تھا اور کوئی مرزا۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ افریقہ سے بھی بہت سے مسلمان ماریشس لائے گئے۔ لیکن وہ بعد میں عیسائی بنا لئے گئے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی کیسے کیسے جتن کئے گئے ہوں گے لیکن صابر آج بھی صابر ہے اور عظیم آج بھی عظیم ہے۔

ماریشس جب خوب آباد ہونے لگا اور یہاں ہر قسم کے ہنر مندوں اور کاریگروں کی ضرورت پڑی تو مالا بار کے ساحل سے لوہار، مستری، بڑھئی، سنار، موچی، درزی اور ملاح لائے گئے۔ ان میں بہت سے مسلمان تھے۔ یہ لوگ تو خیر لائے گئے۔ تاجر خود ہی آ گئے۔ ۱۷٦۰ء کے لگ بھگ پورٹ لوئس کی بندرگاہ میں ڈھاکے کی ململ، سورت کا سوتی کپڑا، گجرات کے برتن اور بمبئی کی مصنوعات فروخت ہونے لگی تھیں۔

اس وقت بندرگاہ میں کام کرنے والے بیشتر ملاح وہ تھے جو ہندوستانی ریاستوں اور رجواڑوں میں سپاہی ہوا کرتے تھے اور جب کبھی کہیں لشکر کشی ہوتی تھی، یہ اپنے ہتھیار سجا کر پہنچ جایا کرتے تھے۔ یہی لوگ جب فرانسیسی حکمرانوں کی ملداری میں پہنچے تو وہاں بھی لشکر کہلائے۔ ان میں بھی زیادہ تر مسلمان تھے۔ بعد میں ماریشس کے سارے ہی مسلمان لشکر کہلائے جانے لگے۔ یہاں تک کہ یہ لفظ فرانسیسی زبان میں شامل ہو گیا چنانچہ اب یہ لفظ طہارت سے محروم ہے، اب کوئی اپنے آپ کو لشکر کہلوانا پسند نہیں کرتا۔

ماریشس کے کاغذات میں سب سے پرانا مسلم خاندان گاسی

صوبے دار کا ملتا ہے۔ اسی فرانسیسی قبضے کے دوران دینا خاندان، گومانی اور شاکر خاندان کا نام بھی کاغذوں میں محفوظ ہے۔

۱۷۶۵ء میں ماریشس میں عشرۂ محرم منایا گیا۔

۱۷۹۸ء میں مسلمانوں نے مسجد بنانے کے لئے فرانسیسی حکمرانوں سے زمین مانگی لیکن انہیں ٹکا سا جواب ملا اور سنا ہے کہ گورنر سخت ناراض بھی ہوا۔ پھر جب گورنر بدلا تو حضور فیض گنجور کے روبرو ایک اور درخواست گزرائی گئی۔ اس مرتبہ بھی شنوائی نہ ہوئی۔ فرانس والوں نے جنوبی ہندوستان کے بعض ساحلی علاقوں میں اچھی طرح قدم جما لئے تھے اس کے باوجود وہ یہی نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ مسجد کیا ہوتی ہے۔ خدا خدا کر کے ۱۶ اکتوبر ۱۸۰۵ء کو مسلمانوں کی بات مان لی گئی۔ انہیں لشکریوں کے علاقے میں ۲۱۵ فرینک لے کر پانچ ہزار مربع فٹ زمین دے دی گئی اور جب سڑک پر مسجد تعمیر ہوئی، فرانسیسی حاکموں نے اس کا نام پیگوڈا اسٹریٹ رکھ دیا۔ ظالم اس وقت تک نہ سمجھے کہ مسجد کیا ہوتی ہے۔

مسلمانوں نے یہ مسجد سال بھر میں بنا دی۔ اس کے پہلے امام گاسی صوبیدار تھے۔ کوئی پچپن سال وہی امامت کا فرض انجام دیتے رہے۔ ماریشس میں ہر پندرہ سولہ سال بعد ایک بڑا طوفان آتا ہے، وہ آتا رہا۔ مسجد کی چھتیں اڑتی رہیں اور دیواریں گرتی رہیں پورا کا پورا لشکر اسے دوبارہ تعمیر کرتا رہا اور گاسی صوبیدار نے کوئی نماز قضا نہ ہونے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۱ء میں ان کے انتقال کے بعد جتنے بھی پیش امام ہوئے سارے کے سارے صوبیدار خاندان کے تھے۔

آج یہ مسجد الاقصیٰ مسجد کہلاتی ہے اور جس سڑک پر یہ واقع ہے وہ اب ڈاکٹر حسن شاکر اسٹریٹ ہے۔ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سنا ہے کہ مسجد کے پہلو میں بالکل شروع میں بننے والی ایک قبر آج تک موجود ہے اور اس پر لگا ہوا کتبہ اردو زبان میں ہے۔

سب سے پہلے فرانس والے ہندوستانیوں کو ماریشس لے گئے' ان میں مسلمان کم نہ تھے۔ پھر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو ہندوستانی کھیت مزدوروں کو لے لے کر جہاز ماریشس پہنچنے لگے۔ ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی آگ بھڑکی اور جب اس آگ کو ظلم سے بجھانے کی کارروائی شروع ہوئی تو دہشت زدہ باپ' سہمی ہوئی مائیں اور سہمے ہوئے بچے مشقت کے وعدے کر کر کے ماریشس کے جہازوں پر سوار ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ ان میں بھی مسلمان کم نہ تھے۔

یہ سب اردو بولتے تھے'

ہندوستانیوں کا آخری جہاز ۱۹۲۲ء میں پہنچا۔ ان میں جو مسلمان تھے ان کے مال اسباب میں قرآن کے نسخے ضرور ہوں گے' فالنامے' نورنامہ' جنتریاں بھی ہوں گی' مناجاتوں کی کتابیں ہوں گی' کلیات میر بہت وزنی تھی اس لئے دیوان غالب ضرور ہو گا۔

ان لوگوں میں علمائے دین بھی تھے' موسیقار بھی تھے اور کہتے ہیں کہ شاعر بھی تھے۔ سنا ہے اتوار کے روز جب مزدوروں کو آزاد اور گنے کے کھیتوں کو تنہا چھوڑ دیا جاتا تھا تو درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر کوئی قرآن اور حدیث پڑھتا تھا' کوئی شعر سناتا تھا اور کوئی آلہ اودل گاتا تھا۔

یہ تو خیر غریب محنت کش تھے' بعد میں سورت اور کچھ سے جو مسلمان تاجر ماریشس پہنچے انہوں نے وہاں اردو کو فروغ دینا شروع کیا۔ ابتدا میں لوگ اپنے گھروں میں اردو پڑھاتے تھے' اس کے بعد یہ ہوا کہ جب کوئی مسجد تعمیر ہوتی' اس میں ایک مدرسہ بھی ہوتا تھا جہاں اردو پڑھائی جانے لگی۔ ۱۸۵۷ء ہی میں پورٹ لوئس کی جامع مسجد قائم ہوئی اور اس میں اردو کی تعلیم شروع ہوئی۔ پندرہ سال بعد پادری ڈبلیو رائٹ رائل کالج میں ہندوستانی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس وقت اردو کو ہندوستانی کہا جاتا تھا۔

اس کے بعد اس کہانی میں بہت سے نام آتے ہیں۔

کوئی خواز علی بخش تھے جو ماریشس پہنچنے والے اردو کے پہلے عالم تھے۔ پٹھان تھے اور سب سے اردو میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اپنے ساتھ بہت سی اردو کتابیں لائے تھے' اردو ہی میں تقریریں کرتے تھے۔ یہ بغاوت ہند سے دو برس پہلے کی بات ہے۔

پھر نئی صدی شروع ہوئے پندرہ برس گزرے تھے کہ مولانا عبداللہ رشید نواب ماریشس پہنچے۔ وہ جامع مسجد میں امامت کے فرائض انجام دینے آئے۔ دن میں پانچ دفعہ وہ نماز پڑھاتے اور روز و شب کے باقی تمام وقت لوگوں کو عربی اور اردو پڑھاتے۔ ان ہی کی کوششوں سے ۱۹۲۶ء میں ماریشس کا مسلم ہائی اسکول قائم ہوا۔ انہوں نے بالغوں کو بھی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کیا اور اردو عربی کے اساتذہ بھی تیار کرنے لگے۔ علم کی روشنی میں ذہن کشادہ ہونے لگے تو جزیرے میں یہ بات پھیلا دی گئی کہ مولانا نواب جوانوں کو گمراہ اور

سے دین کر رہے ہیں۔ اور خیر سے یہ سلسلہ آج تک جاری ہے کہ ادھر ایک شخص نے اچھا کام شروع کیا، دس نے اس کے خلاف شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔

میں جتنے دن ماریشس میں رہا، الحاج سر عبدالرزاق محمد کا ذکر سنتا رہا اور ذکر بھی اتنے ادب اور احترام سے آخر ایک روز کسی سے پوچھنا پڑا کہ یہ سر عبدالرزاق محمد کون تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کی شکل میں مسلمانوں کو اور اردو زبان کو ایسا سرپرست ملا تھا کہ لوگ آج تک انہیں بھلا نہیں پائے۔

اس داستان میں ایک اور نام منشی حئ کا ہے۔ الحاج منشی عبدالحئ احمدی سورت سے گجراتی اور اردو بولتے ہوئے آئے اور بندرگاہ میں آڑھتی کا کام کرنے لگے، پھر وہ کہیں اکاؤنٹنٹ ہو گئے۔ یہیں ان کی شادی ہوئی اور قدرت نے پانچ بیٹیاں اور دس بیٹے عطا کیے۔

منشی صاحب کے بارے میں کہتے ہیں کہ ماریشس میں اردو کی اتنی خدمت کسی اور نے نہیں کی۔ اگرچہ وہ مسلم ہائی اسکول کے پرنسپل تھے مگر اردو کی تعلیم اور ترویج کے لئے وہ ہر جگہ موجود تھے۔ عالمی جنگ کے دوران جب ریڈیو پروپیگنڈہ کا دشوار مرحلہ آیا تو ماریشس ریڈیو نے منشی عبدالحئ احمدی کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے بعد ان کے ہاتھوں تین سال تک ملک کی فضاؤں میں اردو لہروں کی طرح پھیلتی رہی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے عبدالباقی احمدی، عبدالرافع احمدی اور عبدالسلام احمدی ریڈیو اور ٹیلیویژن سے منسلک

ہے۔

ایک روز ریڈیو اسٹیشن میں کسی نے مجھے بتایا کہ یہاں ہندوستان کے گراموفون ریکارڈوں کا نہایت شاندار ذخیرہ ہے جس کو عبدالباقی احمدی نے ترتیب دے کر منظم کیا تھا۔ اب جدید ٹیکنالوجی کے زمانے میں سنا ہے وہ قدیم اور یادگار گراموفون ریکارڈ گرد پھانک رہے ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی اس چھوٹی سی دنیا میں عبدالسلام احمدی کا نام اب تک برقرار ہے۔ ایک روز نشرگاہ کی غلام گردش میں ملے اور مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے' ماریشس ریڈیو میں وہ انڈین پروگرام آرگنائزر کے منصب تک پہنچ گئے تھے مگر وقت نے ان کے ہاتھ قلم کئے اور قدرت نے پاؤں کمزور کر دیئے۔ اب کبھی کبھار ریڈیو پر کام ملتا ہے اور چھڑی ٹیک کر اس کمرے کے سامنے سے گزرتے ہیں جس کے اندر کبھی انہیں وہ نشست نصیب تھی جو ان ہی کا حق تھی۔

ایک روز میں ماریشس کی کتابوں کی ایک دکان کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں اردو کتابوں کا بھلا کیا کام۔ اچانک جو ایک اردو کتاب پر نگاہ پڑی تو دل باغ باغ ہو گیا۔ دیکھا تو پتہ چلا کہ کوئی عبدالوہاب فونڈن تھے' یہ ان کی اردو تحریروں کا مجموعہ ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ آج وہاں اردو کی جو تعلیم ہے' فونڈن صاحب نہ ہوتے تو یہ بھی نہ ہوتی۔

ماہر تعلیم تھے' رکن پارلیمان تھے اور انکی ساری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح نوجوانوں کو اردو پڑھائیں۔ وہ پہلے محض استاد تھے۔ پھر صدر مدرس ہوئے اس کے بعد پرائمری سکولوں میں اردو کے انسپکٹر

مقرر ہوئے آخر انہوں نے ماریشس میں جامعہ اردو' علی گڑھ کے امتحانات شروع کرائے۔ حکومت نے ان امتحانوں کو تسلیم کیا اور عبدالوہاب فونڈن اس کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ کہتے ہیں کہ اس سے جزیرے میں اردو کو بڑا فروغ ہوا اور بقول شخصے اردو پڑھنے والوں کا مطالعہ صرف مذہبی کتابوں تک محدود نہ رہا بلکہ انہیں ادب کی دنیا میں بھی داخل ہونے کا موقع مل گیا۔

فونڈن صاحب کی اردو میں دو تصانیف موجود ہیں' ایک فرانسیسی کہانی کا ترجمہ "پال اور ورجنی" اور دوسری "جزیرہ ماریشس میں ایک نئی تحریک کی کہانی" انہوں نے خود اردو زبان ماریشس ہی میں سیکھی اور اس کے لئے کبھی برصغیر نہیں گئے۔ اس لئے ان کی اردو سے بھوجپوری اسلوب صاف جھلکتا ہے۔

عبدالوہاب فونڈن کی کوششیں رنگ لائیں اور ماریشس میں ادیب ماہر' ادیب کامل کے بعد کیمرج اور لندن کے اولیول اور اے لیول کے امتحان بھی ہونے لگے۔

پھر ۱۹۷۰ء میں یہ ہوا کہ حکومت ماریشس نے اردو کی تعلیم اور تدریس کو منظم کرنے کے لئے علی گڑھ سے اردو کے استاد ڈاکٹر اطہر پرویز کو بلا لیا۔ انہوں نے بڑا کام کیا اور نہ صرف یہ کہ ماریشس کے نوجوانوں کو پڑھنے پڑھانے کا سلیقہ سکھایا بلکہ انہیں بڑی تعداد میں علی گڑھ بھجوانا شروع کیا۔ اب تو میں جس اردو داں نوجوان سے ملا وہ علی گڑھ کا تعلیم یافتہ نکلا۔

ڈاکٹر اطہر پرویز نے ۱۹۷۰ء میں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد

ڈالی۔ پورٹ لوئس میں مسلمانوں کے اس قدیم علاقے میں جسے آپ چاہیں تو لشکری میدان کہہ لیں' ایک بڑے چوک کے کونے کی بالائی عمارت اردو انسٹی ٹیوٹ کے لئے وقف ہے۔ اس میں چھوٹا سا ہال ہے جس کے اندر اس سے بھی چھوٹا اردو کتب خانہ ہے۔ انسٹی ٹیوٹ نے ہندوستان اور پاکستان دونوں سے اردو کتابیں مانگی تھیں۔ ہندوستان سے تو بڑے بڑے بکس بھر کر آ گئے۔ پاکستان کا جہاز ابھی وعدوں کے سمندر میں ہے۔

ماریشس کا یہ نیشنل اردو سنٹر خود چھوٹا سا ہے مگر کام بڑے کرتا ہے۔ اردو کے سارے امتحان لیتا ہے۔ اردو کی تعلیم دیتا ہے۔ مباحثے کراتا ہے' مقابلے کراتا ہے۔ پھر مذاکرے ہوتے ہیں۔ مشاعرے ہوتے ہیں۔ کبھی غالب کی یاد منائی گئی' کبھی سرسید کا تذکرہ رہا' کبھی علامہ اقبال کسی مجلس مذاکرہ کا موضوع بنے۔

۱۹۹۵ء میں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی سلور جوبلی منائی گئی۔

میر' غالب' اقبال اور فیض کی زبان کو بڑھاوا دینے کا کام ایک اور ادارہ بھی کر رہا ہے اور وہ ہے ماریشس کا مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ۔ اس ملک میں ہندوستانی ثقافتوں کو فروغ دینے کے لئے یہ ادارہ ۱۹۷۶ء میں کھولا گیا تھا۔ موکا کے علاقے میں' پہاڑیوں کے دامن میں' سبزہ زاروں کے درمیان یہ انسٹی ٹیوٹ کسی یونیورسٹی کا کیمپس معلوم ہوتا ہے۔ میں وہاں گیا تو بچوں کو اردو پڑھتے دیکھا اور اردو اساتذہ کی تربیت ہوتے دیکھی۔ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کا اپنا نہایت عمدہ ہال ہے جس میں اردو ڈرامے' مشاعرے اور موسیقی کی محفلیں ہوتی

ہیں۔

غالب کے ۱۲۵ ویں یوم وفات پر جس مذاکرے میں شرکت کرنے میں ماریشس گیا تھا اس کا اہتمام اسی انسٹی ٹیوٹ میں فنون اور ثقافت کی وزارت اور نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ نے مل کر کیا تھا۔

یہیں ۱۹۹۱ء میں ماریشس کی پہلی عالمی اردو کانفرنس ہوئی تھی جس میں بھارت' پاکستان' جنوبی افریقہ' مڈغاسکر' کینیا' ملائیشیا اور سنگاپور کے مندوبوں نے حصہ لیا تھا۔ سنا ہے کہ جزیرے میں اس کانفرنس کی ایسی دھوم مچی کہ دیکھتے دیکھتے اردو کے طالب علموں کی تعداد کئی گنا ہو گئی۔

اس کے تین سال بعد جب میں ماریشس گیا تو تن دہی کی عجب کیفیت دیکھی۔ بہت سے چھوٹے بڑے اردو کے فروغ میں منہمک تھے۔ آٹھویں دن وہاں سے لوٹتے ہوئے مجھے دکھ اسی بات کا تھا کہ ان احباب کے نام یاد ہوئے تو جانے کا وقت آ پہنچا۔ ان میں گل حمید بلی گن' عنایت حسین عیدن' عبدالسلام احمدی' فاروق بوچا' قاسم ہیرا' سعید میاں جان' محمد حنیف کنہائی' صابر گودر' فاروق حسنو' مسعودؔ نو' ناز انور عثمانی اور یاسمین بودھی کے نام مجھے ازبر ہیں۔

مگر اس سلسلہ میں ایک نام نظر انداز کرنا مشکل ہے اور وہ ہیں جناب احمد عبداللہ احمد جو ماریشس کے سرکردہ تاجر ہیں اور ان کے معاملے میں قدرت نے فیاضی کا سب سے بڑا مظاہرہ یہ کیا ہے کہ خود انہیں بھی فیاض بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کی بہبود اور اردو کی ترقی کے لئے ان کا دل بھی کھلا ہوا اور ان کے دروازے بھی۔ پورے

معاشرے میں انہیں جس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے بس اسی کو عزت کی نگاہ کہتے ہیں۔

عبداللہ احمد صاحب کا تعلق بنگلور کے ایک معزز میمن گھرانے سے ہے۔ انہوں نے مدراس یونیورسٹی سے تعلیم پائی' برصغیر کی آزادی کے دو سال بعد ماریشس گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ اس سارے قصے میں اردو کہاں سے داخل ہوئی' مجھے معلوم نہیں لیکن ان کے دل میں اردو کو کتنا اونچا مقام حاصل ہے' مجھے معلوم ہے۔

عبداللہ احمد نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے صدر ہیں' یوں ان کا دلکش سا گھرانا بھی کسی اردو انسٹی ٹیوٹ سے کم نہیں کیونکہ ان کی بیگم عزیزہ عبدالکریم اور دونوں بچے' یاسمین اور شہزاد روانی سے اردو بولتے ہیں۔

اردو اور مسلم ثقافت کے لئے ان کی گراں قدر خدمات پر کامیاب تجارت اور بے مثال سماجی خدمات پر ملکہ برطانیہ نے انہیں عشرۂ ۸۰ء کے اوائل میں سی بی ای کا خطاب دیا : کمانڈر آف دی برٹش ایمپائر!

اردو کی خاطر کام کرنے والوں کا تذکرہ اتم وشنو دیال کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ وہ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وشنو دیال گھرانے کے چشم و چراغ ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ رنگ' نسل' مذہب اور زبان کے فرق سے بے نیاز ہو کر وشنو دیال گھرانے نے جزیرہ ماریشس کی سماجی حالت میں انقلاب عظیم برپا کر دیا تھا۔

ڈاکٹر اتم وشنو دیال نے ہندوستان سے آئے ہوئے اردو کے اساتذہ کی بڑی پذیرائی کی' مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے اور مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر دیر تک اس سوال پر غور کیا کہ ماریشس میں اردو کے طالب علموں اور اساتذہ کے استفادے کے لئے کون کیا کر سکتا ہے۔

مجھ سے بڑی تفصیل سے پوچھتے رہے کہ برطانیہ میں تارکین وطن بچوں کو اردو کی تعلیم کیونکر دی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی دریافت کرتے رہے کہ کیا اردو کا کمپیوٹر تیار ہو گیا ہے؟ کیا ایسا کمپیوٹر ماریشس آ سکتا ہے اور یہ کہ جزیرے کے بہت سے نوجوان اخبار' ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں اپنا کیریئر بنانے کے خواہش مند ہیں' کیا آپ کبھی آکر ان کے لئے ورکشاپ کا اہتمام کر سکتے ہیں؟

جب انہیں اردو کمپیوٹر کی خبر نہیں تھی اور اردو کتابیں اور رسالے چھاپنے کا اشتیاق بہت تھا تو ماریشس والوں کو ایک خوش نویس کی ضرورت پڑی —— وہیں مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ میں مجھے ایک ہونہار اور خوش وضع نوجوان سے ملوایا گیا۔" یہ ہیں ارشاد برو کر (ارشاد برکت)۔ ماریشس کے اکلوتے کاتب ہیں۔ خاص طور پر پاکستان بھیجے گئے تھے۔ وہاں سے کتابت سیکھ کر آئے ہیں۔"

میں ہمیشہ سے ٹائپ کا حامی ہوں' کاتبوں کی طرف سے میرا دل کبھی صاف نہ تھا۔ اس روز پہلی بار کاتب اچھا لگا۔

ایک بار ماریشس میں اردو پر بہت برا وقت پڑا۔ کہتے ہیں کہ شمالی افریقہ کے ایک عرب سفارت خانے نے ہندوستانی نسل کے

سولوی حضرات کو یہ سمجھایا اور بجھایا کہ اب ہندوستان سے کٹ گئے ہو۔ اب اردو کو کیوں پیٹے جاتے ہو۔ عربی سکھاؤ عربی۔ ایک تو تمہارے دین کی زبان ہے دوسرے اردو پڑھ کر تو نوجوان جوتیاں چٹخارتے پھریں گے، عربی سیکھیں گے تو کام کرنے مشرق وسطیٰ جا سکیں گے اور وہاں زمین سے جو تیل کی دولت ابل رہی ہے اس کی جھولیاں بھر بھر کر گھر لوٹیں گے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جو حضرات یہ بات سننے سفارت خانے جاتے تھے وہ جیبیں بھر بھر کر گھر لوٹتے تھے۔

دیکھتے دیکھتے جزیرے میں یہ صدا بلند ہونے لگی کہ اردو پر فاتحہ پڑھو اور بچوں کو عربی سکھاؤ۔ سنا ہے کہ اس صدا میں اتنی توانائی بھر دی گئی تھی کہ حکام نے سنجیدگی سے اسکولوں میں اردو ختم کرکے عربی پڑھانے کی کارروائی شروع کردی۔ اس وقت جنہوں نے اردو کے حق میں آواز اٹھائی انہیں سختی سے بٹھا دیا گیا اور جب ذرا شرارے اٹھے تو یہ بھی سنا ہے کہ بعض سیاستدان لپک کر مٹی کا تیل لے آئے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس سے پہلے کہ یہ چھڑکا جاتا، حکومت کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ کچھ اس لئے بھی کہ اسکولوں میں جو بچے باآسانی اردو سیکھ رہے تھے انہیں عربی سیکھنے میں دشواری ہوئی چنانچہ سنا ہے کہ اس عرب سفارت خانے کے ارباب اختیار کو ادھر ادھر کیا گیا۔ اردو کے مخالفوں پر من و سلویٰ اترنا بند ہو گیا اور جوانوں کو دولت کی خاطر تیل پیدا کرنے والے ملکوں کو بھیجنے کا طلسم ٹوٹا۔ وہ تو یوں بھی ٹوٹنا تھا کیونکہ ان کے دادا کے دادا ہندوستان سے یہی کہہ کر لائے گئے تھے کہ ماریچ چلو، وہاں پتھر اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے گنی نکلتی

ہے۔ وہ بچارے اس آس میں پتھر اٹھاتے رہے کہ شاید کسی روز کہیں سے کوئی گنی نکل آئے۔

آج تک کھیتوں کے درمیان قطار در قطار کھڑے ہوئے پتھروں کے اہرام جہازی بھائیوں کی اولادوں کو اس چمکتی دمکتی گنی کا خواب یاد دلاتے ہیں۔

بہرحال، اب جماعتوں میں اردو لوٹ آئی ہے مگر وہ عربی کی تحریک اتنی طاقتور تھی کہ آج تک بعض بچے اجداد کی زبان چھوڑ کر شیوخ کی زبان پڑھ رہے ہیں۔

ماریشس میں اردو پر ایک اور ستم ٹوٹا ہے۔ سفارت خانہ پاکستان یہ محاذ چھوڑ کر پسپا ہو گیا ہے اور یہ میدان سفارت خانہ ہندوستان کو سونپ دیا گیا ہے۔ اس کی کہانی ناقابل یقین ہے۔

ہوا یہ کہ جب اہل ماریشس نے غالب کی یاد منانے کا فیصلہ کیا تو وہ تعاون مانگنے پاکستان کے ہائی کمیشن گئے، اور وہاں کے اہل کاروں سے کہا کہ ہم غالب کی برسی منا رہے ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ اس پر وہاں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ گڑے مردے کیوں اکھاڑتے ہو؟۔ راوی کہتا ہے کہ وہیں بیٹھے ہوئے ایک اور صاحب نے منتظمین سے پوچھا کہ اس جلسے جلوس پر کتنی رقم خرچ کرو گے؟۔ جب انہیں رقم بتائی گئی تو وہ بولے کہ اتنا پیسہ کیوں ضائع کرتے ہو، ہمیں دے دو! اہل کاروں سے درخواست کی گئی کہ غالب کے مذاکرے میں شرکت کے لئے پاکستان سے چند دانشوروں کو بلوا دیجئے۔ جواب ملا کہ سفیر صاحب باہر گئے ہوئے ہیں اور ہم کچھ کر نہیں سکتے۔

اس کے بعد سفیر صاحب نے صرف اتنا کیا کہ "نیک تمناؤں" کا پیغام اپنے لیٹر پیڈ پر ٹائپ کرا کے بھیج دیا اور سچ مچ باہر چلے گئے۔ ماریشس میں پانچ دن تک اردو کے نام پر اجتماع ہوتے رہے۔ ہندوستان کے ہائی کمشنر خود آتے رہے اور جس روز خود نہ آسکے اپنے ڈپٹی کمشنر کو بھیجتے رہے۔ پاکستان کے کسی پرندے نے اس کی طرف آ کر پر بھی نہ مارا۔ راوی کے مکالموں کا تو میں شاہد نہیں۔ مگر اس لاتعلقی کا چشم دید گواہ میں بھی ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ مجھے نہ تو گواہوں کے کٹہرے میں بلایا جائے گا نہ میری گواہی سنی جائے گی۔

بعد میں کسی پاکستانی کو میں نے یہ احوال سنایا تو اس نے بتایا کہ یہاں لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ماریشس والے "پرو انڈیا" ہو گئے ہیں۔ انڈیا کے دوستوں کی لڑی میں پروئے گئے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ غالب کی یاد منانے والے یہی لوگ ہندوستان کے سفارت خانے گئے اور درخواست کی کہ غالب کے موضوع پر تقریر کرنے کے لئے چار دانشور بلا دیجئے اور غالب کی غزلیں گانے کے لئے کوئی گلوکار منگا دیجئے۔ ان لوگوں کی تواضع کی گئی۔ ان کی ضروریات پوچھی گئیں۔ تعاون کا یقین دلایا گیا اور ہائی کمشنر نے باہر آ کر اور کار کا دروازہ کھول کر ان لوگوں کو رخصت کیا۔ ادھر دہلی، لکھنؤ، علی گڑھ اور حیدر آباد کی یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں کے سربراہوں کو ماریشس چلنے کی دعوت دے دی گئی۔ ان کے پاسپورٹ تیار نہ تھے وہ راتوں رات بن گئے، ہوٹلوں میں کمرے اور ہوائی جہازوں میں نشستیں محفوظ ہو گئیں اور وقت مقررہ پر تین دانشور،

ایک گلوکارہ جو لڑکیوں کے کالج کی پروفیسر بھی ہیں اور ان کے تین سازندے ماریشس میں اتر گئے۔

اب ماریشس والے 'پرو انڈیا' نہیں ہوں گے تو کیا ہوں گے؟

لوگ ایک پاکستانی سفیر کا نام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ویسا دردمند اور عام لوگوں میں گھل مل کر رہنے والا ہائی کمشنر پھر کبھی نہیں آیا۔ یہ لوگ بتاتے ہیں کہ اس کے بعد ایک سفیر باتدبیر تشریف لائے جنہیں اعلیٰ سے اعلیٰ سگار پینے اور عمدہ سے عمدہ شکار مارنے کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ آتے ہی انہوں نے جنگلوں میں دوڑنے اور پہاڑوں پر چڑھنے والی لینڈکروزر خریدی اور پھر سارا وقت لذیذ گوشت والے پرندوں کے پیچھے گزارا۔

ماریشس کے لوگ ایک اور واقعہ سناتے ہیں اور خوش ہو کر نہیں بلکہ حلق سے کڑوے گھونٹ اتارتے ہوئے سناتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ پاکستان سے بیگم نون ماریشس تشریف لائیں۔ لوگوں سے ملیں' ان کے دکھ سکھ سنے۔ لوگوں نے کہا کہ کچھ اردو کے فروغ کا انتظام کر دیجئے۔ یہاں ایک عربی کی لابی بن گئی ہے اس لئے اردو کی خاطر جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ بس ایک اچھی سی اردو کی لائبریری بنوا دیجئے۔ پاکستان میں لاجواب کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ کچھ کتابیں بھجوا دیجئے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ بیگم نون نے کہا۔ "بس اب آپ بے فکر ہو جائیے اور باقی کام مجھ پر چھوڑ دیجئے۔"

کئی برس ہو گئے۔ لوگوں کو یقین ہے کہ ایک روز اردو کتابوں

سے لدا ہوا طیارہ اترے گا۔

ہاں تو اسد اللہ خاں غالب کی یاد تازہ کرنے کا تذکرہ تھا۔

ہفتے بھر کی تقریبات کے دوران ایک روز خبر ملی کہ صدر مملکت نے سارے مندوبوں کو ایوان صدر آنے کی دعوت دی ہے۔ صدر قاسم الیتم بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ وہ کالج کے ڈبیٹر اور اسٹیج کے ایکٹر سے لے کر ملک کے وزیر تک رہ چکے ہیں۔ غالب کے بڑے مداح ہیں اور اس نسبت سے اردو کے قدر دان بھی ہیں۔

ماریشس کے ایک حسین باغ کے درمیان ان کا دل کش ایوان صدر ہے۔ سنا ہے دن بھر وہاں رہ کر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں اور رات کو اپنے پرانے گھر چلے جاتے ہیں اور وہ سارا وقت اہل خانہ کے ساتھ گزارتے ہیں۔

اس دن بتانے لگے کہ والدہ اور دوسرے بزرگ گھر میں بھوجپوری بولتے ہیں چنانچہ گھریلو گفتگو وہی مغربی بہار اور مشرقی یو پی جیسے لب و لہجے میں ہوتی ہے۔

لمبا چوڑا قد' بھاری بھرکم آواز' ذرا دھنسی ہوئی ذہین آنکھیں اور دلکش ڈاڑھی میں جا بجا سفید دھاریاں اچھی لگیں۔

صدر ہم سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے کہا کہ میں باہر سے آیا ہوں اور میرا مشاہدہ بالکل غیر مشروط ہے' مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ماریشس میں اردو زبان کی بنیادیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔

کہنے لگے کہ سچ تو یہ ہے کہ بزرگوں کی تمام ایشیائی زبانوں کی بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں۔ اردو کی طرح ہندی' تامل' بنگالی' گجراتی'

تیلیگو، مراہٹی، چینی، یہاں تک کہ بھوجپوری بھی مستحکم نہیں۔ اب یہاں بول چال کی زبان کریول اور پڑھنے لکھنے کی زبان فرانسیسی اور انگریزی رہیں گی۔ پھر کہنے لگے کہ حکومت کو نہ صرف اس بات کا احساس ہے بلکہ یہ خواہش بھی ہے کہ آبائی ایشیائی زبانیں زندہ رہیں۔

اس کے بعد صدر نے یہ خوشخبری سنائی کہ ۹۵ء سے ایشیائی زبانیں باقاعدہ قومی نصاب کا حصہ بن جائیں گی۔ ان کی باضابطہ تعلیم ہو گی۔ ان زبانوں کے ممتحن اور پرچے غیر ممالک سے نہیں آئیں گے بلکہ تمام دوسرے علوم مثلاً ریاضی، تاریخ، سائنس اور جغرافیے کی طرح اردو، ہندی، تامل وغیرہ کے امتحانات بھی قومی نصاب کے تحت ہوں گے اور ان پرچوں میں طالب علموں کو جو نمبر ملیں گے ان سے وہ امتحان میں اپنی پوزیشن بہتر بنا سکیں گے۔ جب اس قسم کی تحریک ملے گی تو طالب علم زیادہ ذوق و شوق سے یہ زبانیں پڑھیں گے۔ ابھی وقت ہے۔ ابھی یہ زبانیں بچائی جا سکتی ہیں۔

ہم ایسی اچھی خبر سن کر لوٹنے لگے تو ایوانِ صدر کا باغ اور زیادہ خوبصورت اور عمارت اور زیادہ دلکش لگی۔ *

---

* لیکن دسمبر 95ء تک یہ ہوا کہ جزیرے کے غیر ایشیائی باشندوں نے کہا کہ ہمارے بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ اپنی یہ دلیل عدالت میں لے گئے۔ عدالت نے ان کا استدلال تسلیم کر لیا۔ حکومت نے چاہا کہ پارلیمنٹ آئین میں ترمیم کر کے عدالت کا فیصلہ کالعدم کر دے۔ پارلیمنٹ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حکومت نے ملک میں نئے انتخابات کرا لئے۔ تازہ خبر یہ ہے کہ حکومت کو شکست ہو چکی ہے۔

غالب اور ماریشس

کبھی کسی نے سوچا ہے کہ ماریشس سے میرزا غالب کا کیا تعلق ہے؟

جزیرے کے صدر قاسم اتیم صبح اپنی تقریر میں یہ سوال کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد دن بھر غالب کا ذکر رہا لیکن اس سوال کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔

غالب کی ۱۲۵ویں برسی کے موقع پر اس مجلس مذاکرہ کا اہتمام وہیں مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے ہال میں کیا گیا تھا۔ ہم پہنچے تو بیشتر مہمان آ چکے تھے۔ چائے سے تواضع ہو رہی تھی اور ایک اچھی بات یہ تھی کہ لوگ بن سنور کر' اہتمام کر کے آئے تھے۔ وہاں پہلی بار ماریشس کے اردو داں طبقے سے ملاقات ہوئی۔ ہر ایک گرم جوشی سے ملا۔ ہر ایک سے گفتگو ہوئی اور یہ سیدھے سادے لوگ اچھے لگے۔

اس دن محکمہ تعلیم نے اردو کے تمام طالب علموں اور استادوں کو چھٹی دے دی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ وہ سب غالب سیمینار میں شریک ہوں۔ چنانچہ ادھیڑ عمر اساتذہ سے لے کر نوخیز لڑکے لڑکیوں تک مجمع میں ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔ عمائدین شہر بھی تھے۔

صنعت کار، تاجر اور بینکار بھی تھے۔ کچھ علمائے دین نظر آئے۔ کچھ مختلف وزارتوں کے حکام نظر آئے۔ جس کا اردو سے ذرا سا بھی تعلق تھا وہ آیا تھا۔ آیا نہ آیا، سفارت خانہ پاکستان کا عملہ ہی نہ آیا۔

افتتاحی رسوم کے بعد جب اصل مذاکرہ شروع ہوا تو اس کی پہلی نشست کا صدر مجھے بنا دیا گیا۔ اس اجلاس میں علی گڑھ کے پروفیسر نعیم احمد اور لکھنؤ کے پروفیسر محمود الحسن کو تقریر کرنی تھی۔ اسٹیج پر دنیائے علم کی اتنی بھاری بھرکم شخصیات اور سامنے حاضرین میں بھولے بھالے لوگوں کو دیکھ کر مجھے اپنے ابتدائی کلمات میں مقررین سے کہنا پڑا کہ سہل اور سادہ تقریر کریں اور حاضرین کو مشورہ دیا کہ تقریروں کے بعد سوال ضرور پوچھیں کیونکہ یک طرفہ مکالمہ اچھا نہیں لگتا ——

دونوں نے میری بات نہیں مانی۔

نعیم احمد صاحب ہندوستان سے طویل مقالہ لکھ کر لائے تھے۔ چنانچہ اب عین وقت پر اسے سہل بنانا کچھ سہل نہ تھا۔ غالب کی فنی انفرادیت کے موضوع پر وہ بولتے گئے بولتے گئے یہاں تک کہ نوجوان مجمع نے پہلو بدلنے شروع کئے۔

ان کے بعد محمود الحسن صاحب کی باری تھی۔ وہ بھی نہ صرف یہ کہ اپنا مقالہ ہندوستان سے لکھ کر لائے تھے بلکہ کسی قدیم بیاض سے نکال کر لائے تھے اور لانے سے پہلے اس پر نگاہ ڈالنا بھول گئے تھے۔ شاید یہی سبب تھا کہ 'شکست کی آواز' کے عنوان سے پڑھے جاتے والے اس مقالے میں ان کی آواز قدم قدم پر شکست کھا رہی تھی۔

اساتذہ کی بے ادبی مجھے منظور نہیں مگر اتنے طویل اور گاڑھے مقالے پڑھے جانے کے لئے بمبئی کے ساحل سے چار ہزار سات سو کلو میٹر دور کی سرزمین قطعی مناسب نہ تھی۔

مقررین کی نفسیات عجیب ہوتی ہے۔ انہیں ذرا سا بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ کب سامعین اکتا گئے' کیوں لڑکیاں اور لڑکے اٹھ کر جانے لگے اور کہاں انہیں اپنی تقریر ختم کردینی چاہیے۔

کھانے کا وقفہ ہوا تو میں نے حیدر آباد کے پروفیسر یوسف سرمست کو سمجھایا یہ لکھی ہوئی تقریر نہ پڑھیں' برجستہ بولیں اور غالب کی شاعری کی بات بہت ہوئی' غالب کی نثر نگاری کی بات کریں کہ اگر وہ نہ ہوتی تو آج نہ رشید احمد صدیقی ہوتے نہ مشتاق احمد یوسفی۔

وہ مان گئے۔ سرمست جو ہوئے۔

اگلے سیشن کی صدارت نعیم احمد صاحب نے کی۔ منتظمین نے مجھ سے کہا تھا کہ غالب کی مقبولیت میں میڈیا کے کردار پر تقریر کروں۔ میں ہلکا پھلکا سا مقالہ لکھ کر لے گیا جس میں کہا گیا کہ یہ عجیب بات ہے کہ غالب ہوں یا میر' سودا ہوں یا اقبال ان کے متعلق ساری کتابیں صرف اہل علم لکھتے ہیں اور اہل علم ہی پڑھتے ہیں کبھی کسی کو خیال نہ آیا کہ جن عوام سے میر گفتگو کرتے تھے کوئی ان کے لئے بھی میر کی زندگی پر سہل سی کتاب لکھ دے اور جن گانے والوں کے لئے غالب کو آسان زبان میں غزلیں لکھنی پڑی تھیں۔ کوئی ان کے لئے بھی غالب کی شاعری پر آسان زبان میں کتاب لکھ دے۔

میں نے کہا کہ بالآخر یہ کام میڈیا کو انجام دینا پڑا۔

میں نے کہا کہ غالب کی زندگی پر فیچر فلمیں اور ٹیلی ویژن کے سیریل نہ بنے ہوتے تو عام لوگوں کے لئے غالب کبھی کے مر گئے ہوتے اور یہ کہ سڑک چلتے لوگ غالب کے وہی شعر گنگناتے ہیں جو ثریا اور اور طلعت محمود نے گائے تھے اور گفتگو میں لوگ غالب کے وہی شعر دہراتے ہیں جو ٹی وی سریل میں نصیرالدین شاہ نے پڑھے تھے۔

میں نے کہا کہ اخباروں میں غالب پر جو مضمون چھپتے ہیں اور ریڈیو اور ٹیلیویژن پر غالب کے متعلق جو گفتگو ہوتی ہے وہی ہمارے آنگن اور دالان میں سنی جاتی ہے اور غالب کی صد سالہ تقریبات پر ڈاکٹروں اور پروفیسروں نے کیا کہا تھا' وہ تو کسی کو خبر نہیں لیکن لندن میں یوسف خان عرف دلیپ کمار نے جو کچھ کہا تھا' بی بی سی کی نشریات کے ذریعے وہ گھر گھر پہنچا تھا۔

اس کے بعد سیمینار میں ساری گفتگو میرے مقالے پر ہوئی۔

آخر سوال و جواب کا مرحلہ آگیا اور سامعین کے اتنے بڑے مجمعے کو دعوت دی گئی کہ وہ مقررین سے سوال پوچھے۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔

آخر میں اٹھا اور کہا کہ آپ کے صدر مملکت صبح ایک سوال پوچھ رہے تھے کہ غالب اور ماریشس میں کیا تعلق ہے' لیجئے میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ یہ بات سنی تو اہل جلسہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا کہ ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ کلکتے میں اردو کتابیں چھپنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس کے ۳۲ سال بعد جب بہار اور یوپی کے لوگ ماریشس کے لئے بھرتی کئے جانے لگے اور جہازوں پر بیٹھنے کے لئے انہیں کلکتہ

بھیجا جانے لگا تو پانچ سال کے وعدے پر اتنی دور جانے سے پہلے پڑھے لکھے لوگ کلکتے کے بازاروں میں جا کر ایک دو کتابیں ضرور خریدتے ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ ان میں ایک نسخہ قرآن کا ہوتا ہو گا اور چونکہ کلکتے کا چھپا ہوا دیوان میر بہت وزنی تھا اس لئے بہت ممکن ہے کہ ان کے مال اسباب میں دوسرا نسخہ دیوان غالب کا ہوتا ہو گا۔ سنا ہے کہ ان میں کچھ لوگ شاعر تھے اور کچھ گلوکار بھی تھے اس لئے غالب امکاں یہی ہے کہ دیوان غالب ان ہی دنوں ماریشس پہنچ گیا ہو گا۔

میں نے کہا کہ جب غالب خود کلکتے گئے اور وہاں دخانی جہاز چلتے دیکھ کر اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ اپنے فارسی اشعار میں ان کا ذکر کیا تو ممکن ہے کہ ان جہازوں پر انہیں اتنا پیار اس لئے آیا ہو کہ ان پر لادے جانے والے مال اسباب میں انہوں نے اپنا دیوان بھی دیکھا ہو گا۔

میں نے کہا کہ برصغیر میں ان دو کتابوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک زمانے میں تاج کمپنی بس یہی دو کتابیں چھاپتی تھی۔ چنانچہ اردو ادب و شاعری کا اس جزیرہ میں پہلا بیج دیوان غالب کی شکل میں پڑا ہو اور اگر یہ سچ ہے کہ یہاں پہلا عشرہ محرم ۱۸۶۰ء میں منایا گیا تو کیا عجب کہ یہاں انیس اور دبیر کے مرثیوں کی بیاضیں بھی پہنچ گئی ہوں گی۔

اہل ماریشس اپنے صدر کے سوال کا یہ جواب سن کر خوب محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد حاضرین جلسہ کو دوبارہ دعوت دی گئی کہ وہ

کوئی سوال پوچھیں۔

ہال میں پھر سناٹا چھا گیا۔

اس بار میں اسٹیج سے اتر کر سامعین کے درمیان پہنچا اور اپنے احباب کو دو تین سوال سجھائے۔ تب کہیں سوال و جواب کے سیشن میں جان پڑی اور پھر لطیف گفتگو ہوئی۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ وہ طویل نہ تھی اور ہندوستان سے لکھ کر نہیں لائی گئی تھی۔

کارروائی ختم ہوئی تو ہم جلسہ گاہ میں موجود مجمع میں گھل مل گئے۔ صبح تک ہم جس جزیرے میں اجنبی تھے' اب وہ جزیرہ دوستوں سے بھر چکا تھا۔

اس غالب سیمینار کا اہتمام ماریشس کے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ نے کیا تھا لیکن اس میں فنون' ثقافت اور نوجوانوں کے امور کی وزارت بھی برابر کی شریک تھی۔

اس وزارت کے وزیر مسٹر کیشور چونی نے اسی شام تمام مندوبوں اور منتظمین کو چائے پر مدعو کیا۔ چونی صاحب دیکھنے میں نوجوان لیکن درحقیقت جزیرے کے پرانے باشندے ہیں اور جس علاقے سے منتخب ہوئے ہیں وہاں اردو بولنے والوں کی خاصی بڑی آبادی ہے اس لئے اردو کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ خود اردو سمجھ لیتے ہیں لیکن بولنے میں ذرا دشواری محسوس کرتے ہیں۔

ہم لوگ دارالحکومت پورٹ لوئس میں ان کے دفتر گئے تو دفتر کی شان و شوکت سے نہیں بلکہ اس کی سادگی سے متاثر ہوئے۔ چائے پر نہ صرف وزیر موصوف بلکہ ان کے مشیر بھی موجود تھے۔ وزیر

تک ماریشس کی ثقافت کی باتیں ہوتی رہیں۔ بتانے لگے کہ بمبئی کی فلمی صنعت کا رخ اب ماریشس کی طرف ہے اور جب سے فلم والوں کا کشمیر جانا بند ہوا ہے وہ خوبصورت منظروں کی فلم بندی کے لئے ماریشس آنے لگے ہیں چنانچہ اکثر نیلے ساحلوں پر کیمرے لگے نظر آتے ہیں اور ناچ گانے کا عمل جاری ہوتا ہے۔

سنا ہے کہ کوئی صاحب ماریشس میں فلم اسٹوڈیو بھی کھول رہے ہیں تاکہ بالی وڈ (بمبئی کی فلم گاہ) سے آنے والے یونٹوں کو ان ڈور شوٹنگ کی سہولت بھی حاصل ہو سکے۔

اسی دوران ماریشس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں اور تقریبوں کا ذکر چھڑ گیا۔ چونی صاحب کے ایک ساتھی نے بتایا کہ ماریشس آنے والے مسلمانوں نے یہاں سب سے پہلے عشرہ محرم منایا تھا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

یہاں میں مقامی صحافی اور مصنف ممتاز امرت کا ذکر کرنا چاہوں گا جنہوں نے ماریشس کے مسلمانوں کی تاریخ لکھی ہے جو اس موضوع پر سب سے مکمل، جامع اور وقیع کتاب ہے۔

اس میں لکھا ہے کہ جب فرانس والوں کا نیا نیا قبضہ ہوا تھا یہاں اس وقت محرم منایا گیا تھا۔ یہ بات غالباً ۱۷۶۵ء کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے ۳۴ سال بعد جب ٹیپو صاحب، سلطان میسور کے دو ایلچی ماریشس آئے تو اس برس محرم بہت ہی دھوم دھام سے منایا گیا۔

ممتاز امرت کی تحقیق یہ ہے کہ ماریشس میں پہلے پہل عشرۂ محرم جنوبی ہندوستان، خصوصاً کوکن اور کوبالا سے آنے والوں نے منایا

جہاں تعزیے کو غون کہا جاتا ہے چنانچہ یہاں یہ نام آج تک رائج ہے۔ اس کے علاوہ یہاں محرم کو یا میہ بھی کہا جاتا ہے اور غالباً فرانس والوں نے ماتم کرنے والوں کی جب یا حسینؓ یا حسینؓ کہتے سنا تو وہ اسے یا میہ سمجھے۔ اسی طرح محرم کی آٹھ تاریخ کو نکلنے والا ماتمی جلوس کچھ فرانسیسی لہجے میں ایلیز دوری کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ عزاداری کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

کہتے ہیں کہ جب اس نو آبادی میں پہلے پہل محرم منایا گیا تو مسیحی کلیسا نے اس کی سخت مخالفت کی لیکن فرانسیسی حاکموں کو خدا جانے کیا ہوا اور انہوں نے غیر معمولی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماتم اور عزاداری کی اجازت دے دی۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان شہزادوں، خصوصاً میسور کے والی حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے فرانس والوں کے بہت اچھے تعلقات تھے اس لئے انہوں نے اپنی روایت ترک کر کے ماریشس کے مسلمانوں کو عشرہ محرم منانے کی اجازت دے دی۔

اسی طرح یہاں ۱۲ ربیع الاول کو یوم النبیؐ منایا جاتا ہے۔ اس کی بنا سورت سے آئے ہوئے مسلمانوں نے ۱۹۳۱ء میں ڈالی اور اس روز نہ صرف انگریزی اور فرنچ بلکہ اردو میں بھی تقریریں ہوئیں۔ اب تو یوم النبی پر قومی تعطیل ہوتی ہے اور اس کی تقریبات میں ملک کے صدر، وزیر اعظم، کابینہ کے وزیر اور دوسرے عقیدوں سے تعلق رکھنے والے عمائدین بھی شریک ہوتے ہیں۔

یہی حال عیدین، شب معراج، شب برات اور لیلتہ القدر کا

ہے۔ اور تو اور جمعرات کی شب سلسلہ ذکر بھی ہوتا ہے جو درویشوں کے رقص سے ملتا جلتا ہے۔

خیر سے یہاں پیروں فقیروں کے مزار اور درگاہیں بھی ہیں۔ پیر سید جمال شاہ تو جامع مسجد کے پچھواڑے دفن ہیں' ان کے علاوہ ایک مقامی قبرستان میں ان کے بھائی باوا جہانگیر شاہ کی درگاہ ہے۔ اسی طرح پیر ظہور شاہ کا مقبرہ ہے جہاں منتوں' مرادوں' عبادتوں اور ریاضتوں کا سلسلہ جاری ہے۔

اب تو سنا ہے کہ جیسے پہلے کبھی سمندری جہازوں میں بھر بھر کر برصغیر سے مزدور آتے تھے' اب ہوائی جہازوں میں بھر بھر کر پیر آ رہے ہیں —— زندہ پیر!

ہاں تو وزیر ثقافت کی ضیافت میں تہواروں کی بات ہو رہی تھی۔ کسی ہندوستانی نے پوچھا کہ یہاں رام لیلا ہوتی ہے؟ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ پھر دسہرے کے حوالے سے وہ سمجھ پائے البتہ انہوں نے بتایا کہ ماریشس کے ہندو جس طرح مہاشیوراتری مناتے ہیں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یہ تہوار فروری کے آخر یا مارچ کے وسط میں پڑتا ہے اور پھر تین دن تک جزیرے میں کچھ اور نہیں ہوتا۔

قصہ یہ ہے کہ ماریشس میں پرانے آتش فشاں کے دہانے میں جھیل بن گئی ہے۔ گرینڈ بسین کی اس جھیل میں ہندوؤں نے لا کر گنگا کا پانی ملا دیا ہے اور اسی روز سے اسے مقدس مان لیا ہے اور طے کر لیا ہے کہ شیوجی اسی میں نہائے تھے۔ چنانچہ مہاشیوراتری منانے کے

لئے لاکھوں کی تعداد میں لوگ سفید لباس پہن کر اور ٹولیاں بنا کر اس جھیل کی طرف پیدل چلتے ہیں۔ اپنے گھروں سے جھیل تک یہ فاصلہ بعض لوگ ایک دن میں اور بعض دو دن میں طے کرتے ہیں۔ سمجھئے کہ دو دن تک ماریشس کی سڑکوں پر میلے کا سماں ہوتا ہے۔

اس کے بعد وہی گنگا والا نظارہ ہوتا ہے۔ ایک خلقت اس جھیل میں اشنان کرتی ہے۔ سورج کو پرنام کرتی ہے اور گنگا جل کا تبرک اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔

جب یہ یاتری واپس لوٹتے ہیں تو راستے میں پڑنے والے دیہات کے باشندے انہیں پھل اور شربت پیش کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ماریشس میں اس سے بڑی کوئی اور تقریب نہیں ہوتی۔

وزیر ثقافت سے ثقافت کی یہ ڈھیر ساری باتیں سن کر ہم واپس لوٹے تو خوبصورت کتابچوں کا تبرک اپنے ساتھ لیتے گئے۔

جزیرے کا ایک چکر

فاروق بوچا لاجواب آدمی ہیں۔

اردو کے نام پر اگر کہیں کچھ ہو رہا ہو' تو آپ بہت سے لوگوں کو تقریریں کرتے ہوئے اور اپنی تصویریں اترواتے ہوئے دیکھیں گے۔ بہت سے لوگ اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے البتہ ایک شخص پس منظر میں بری طرح دوڑ دھوپ کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ وہی فاروق بوچا ہیں۔

اردو کے استاد ہیں۔ علی گڑھ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے کنوینر ہیں اور ماریشس میں فاروق نام کے تمام لوگوں کی طرح مفلوک الحال بھی نظر آتے ہیں لیکن کام میں مستعد' چاق و چوبند' پابند' گرم جوش اور حیرت انگیز طور پر دلچسپ اور باذوق۔

کار بہت تیز چلاتے ہیں۔ باتوں کی رفتار کا بھی غالباً کار کی رفتار سے کسی قسم کا روحانی رشتہ ہے۔ ماریشس کے ہر موضوع کے استاد ہیں۔ لوگ آپ کے سوال کا صرف جواب دے کر رہ جاتے ہیں۔ فاروق بوچا اس کے پورے پس منظر میں اور تمام تر گہرائی میں جاتے

ہیں اور آپ کو ہمراہ لے جاتے ہیں۔ شاید اسی لئے جزیرے کی سیر
کرانے کے لئے مہمانوں کو ہمراہ لے جانے کا کام انہیں سونپا گیا۔
بیک وقت مہمانوں اور جزیرے کے نصیب جاگ گئے۔ چپے چپے کے
متعلق معلومات کے دریا بہادیئے گئے اور بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے
اعلیٰ سینئر استاد ان کی باتوں میں یوں منہمک نظر آئے جیسے خود چھوٹے
سے بچے ہوں اور کسی بڑے جہاں دیدہ استاد کا لیکچر سن رہے ہوں۔

بوچا صاحب نے ہمیں کار میں بھرا اور روانہ ہو گئے۔ یہ دیکھئے
وہ دیکھئے۔ ادھر دیکھئے۔ ادھر نہ دیکھئے۔ راستے بھر یہی سلسلہ جاری رہا
اور کیا مجال جو ایک لمحے کو بھی سر چکرایا ہو۔

سب سے پہلے ہم مغربی ساحل پر گئے۔ سپاٹ سا علاقہ تھا۔
زمین خشک پڑی تھی اور فواروں سے آب پاشی ہو رہی تھی۔ پتہ چلا
کہ اس علاقے میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ اتنے ذرا سے جزیرے
میں بھی کوئی حصہ خشک ہے کوئی مرطوب۔ کوئی ہواؤں کی زد میں ہے
اور کوئی ساکن۔

یہ فلک این فلاک کا ساحلی علاقہ کچھ فاروقوں کی طرح نظر آیا'
ذرا سا مفلوک الحال۔ طویل ساحل پر ہماری طرف کی باریک ریت
نہیں بلکہ ان کی طرف کا سیپیوں کا باریک چورا بچھا ہوا تھا۔ سمندر کے
ساتھ ساتھ درخت لگے ہوئے تھے۔ بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور
رونق اس لئے کم تھی کہ سنا ہے وہاں چھٹی والے دن خصوصاً راتوں کو
کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ ضرور چھلتا ہے کیونکہ لوگ قدم قدم پر
استعمال شدہ ربڑ پھینک گئے تھے۔

اسی ساحل پر ایک عجیب سخت سا بیج دیکھا جو درختوں کے نیچے پھیلا ہوا تھا اور اس میں ہر جانب سخت نوکیلے کانٹے سے نکلے ہوئے تھے۔ بوچا صاحب نے بتایا کہ جب وہ نوعمر تھے اور جماعت میں کسی لڑکے کو سزا دی جاتی تھی تو اس کے گھٹنے فرش پر ٹیک کر دونوں گھٹنوں کے نیچے ایک ایک خاردار بیج رکھ دیا جاتا تھا۔

میں نے کچھ بیج اٹھا کر ہندوستان سے آئے ہوئے اساتذہ کو پیش کیے۔ "یہ لو ماریشس کی سوغات۔ شریر لڑکوں کو سزا دینے کے کام آئے گی۔"

"بس رہنے دیجیے۔" جواب ملا —— "لڑکے یہ بیج ہمارے ہی گھٹنوں کے نیچے رکھ دیں گے۔"

ساحل کے ساتھ ساتھ ہزاروں کوٹھیاں اور بنگلے تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ سب سرکاری زمین پر بنے ہوئے ہیں اور یہ زمین منظور نظر لوگوں کو صرف ایک روپیہ فی ایکڑ پٹے پر دی جاتی ہے جس سے لوگ لاکھوں کماتے ہیں۔ یہی حال بسوں کے لائسنس کا ہے۔ خاص خاص لوگوں کو دیئے جاتے ہیں چنانچہ بسوں کے کرائے اتنے زیادہ ہیں کہ چھوٹا سا کنبہ کہیں جائے اور شام کو لوٹ کر آئے تو سوا سو ڈیڑھ سو روپے اٹھ جاتے ہیں (ہندوستان کے ڈھائی تین سو روپے)

ذرا آگے چلے تو کسیلا برڈ پارک ملا جو پہاڑ کے دامن میں کھلا ہوا چڑیا گھر تھا۔ اس میں گلابی کبوتر رہتے ہیں اور ایک بڑا سا کچھوا رہتا ہے جس نے ابھی اپنی ایک سو پچاسویں سالگرہ منائی ہے۔

ذرا آگے تمرین کا علاقہ ہے جسے اردو میں املی، انگریزی میں

ٹمرینڈ اور عربی میں ثمرہند کہتے ہیں۔ یہیں ہم نے دیکھا' سمندری پانی کا پانی اڑا کر نمک بنایا جا رہا تھا۔ کتنی آسانی ہے۔ املی توڑیئے اور نمک سے لگا کر کھایئے۔

راستے میں وہ اونچے مینار نظر آئے جن پر چڑھ کر فرانسیسی فوج سمندر پر نگاہ رکھا کرتی تھی اور دشمن کے جہازوں پر گولے برساتی تھی۔ کچھ آگے آبشاروں کا علاقہ آیا' رنگا رنگ مٹی کی سرزمین آئی جس میں دھنک کی طرح سات رنگوں کی ریت بچھی ہے۔

اور آگے گرینڈ بسین کی جھیل ہے جس کا رشتہ گنگا میا سے جوڑ کر اسے پوتر بنا دیا گیا ہے۔ مہاشیوراتری منانے جزیرے بھر کے ہندو یہاں آتے ہیں۔

وہیں وہ بلند قامت چٹان کھڑی ہے جو جبل الطارق سے زیادہ دہشت زدہ غلاموں کی یاد دلاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس چٹان کی چوٹی پر چڑھنا ناممکن ہے لیکن انیسویں صدی کے شروع میں اپنے آقاؤں کے مظالم سے تنگ آ کر کچھ غلام وہاں پہنچ گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جزیرے میں غلامی ختم بھی ہو گئی لیکن ان بے چاروں کو خبر نہ ہوئی۔ ایک روز انہوں نے دیکھا کہ کچھ فوجی اسی چٹان پر چڑھنے آ رہے ہیں۔ وہ سمجھے کہ انہیں پکڑنے آ رہے ہیں۔ انہوں نے گھبرا کر چھلانگ لگا دی اور جان دے دی۔ اسے آج تک دکھوں کی چٹان کہتے ہیں۔

ہم اور آگے چلے تو آبادی کم ہوتی گئی اور علاقے کا حسن بڑھتا گیا۔ بھوری ریت' نیلا پانی' اس سے زیادہ نیلا آسمان' اس کے اوپر

سیاہ بادل جن کی پشت پر چلتا ہوا سورج' شفاف ہوا' ڈھلے ہوئے درخت' کچھ لہروں کا شور کچھ سمندری چڑیوں کا۔ پتوں میں ہوا کی سرسراہٹ' یہاں تک کہ وہ سیاہ چٹانیں آگئیں جن سے سمندر سر ٹکراتا ہے۔ ماریشس کے اداس' مایوس اور ہارے ہوئے نوجوان وہیں خودکشی کرتے ہیں۔ کبھی تنہا اور کبھی ہاتھوں میں ہاتھ تھامے دو۔

ذرا آگے چلے تو مندر آگئے۔ جہاں جنگل ختم ہوتے وہاں گنے کے کھیت شروع ہو جاتے' بند پڑی ہوئی شکر سازی کی فیکٹریوں کی بیکار چمنیاں آ جاتیں۔ اور کچھ نہ آتا تو شراب کشید کرنے کی فیکٹریاں آ جاتیں۔

غرض جب تک اندھیرا نہیں ہوا اور ہم تھک کر نڈھال نہیں ہوئے' کچھ نہ کچھ آتا رہا یہاں تک کہ نیند آ پہنچی۔

ماریشس کا جنوبی ساحل جتنا طوفانی ہے' شمالی ساحل اتنا ہی پرسکون ہے۔ وہاں ہوائیں قطب جنوبی کی طرف سے آتی ہیں' خط استوا کی جانب سناٹا ہے۔

شمال مغربی ساحل پر تو سیاحوں کا راج ہے۔ وہاں ایک الگ دنیا آباد ہے جس کا باقی ماریشس سے کوئی رشتہ نہیں۔ دنیا بھر کے سیاح ہوائی اڈے سے وہاں پہنچتے ہیں' آٹھ دن دس دن وہیں رہتے ہیں اور وہیں سے جا کر واپسی کے ہوائی جہاز پر سوار ہو جاتے ہیں۔ یہ ساحل جتنا دلکش ہے اتنے ہی دلفریب وہاں کے ہوٹل ہیں جن کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان ہوٹلوں کے اندر ان کی اپنی دنیا آباد ہے۔ ساری خرید' تمام فروخت' ہر قسم کا ناچ اور ہر انداز کا گانا

سب ہوٹلوں کے بڑے بڑے احاطوں میں ہوتا ہے۔ رات کو جب باقی ماریشس اپنے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جاتا ہے' ان ہوٹلوں کے اندر زندگی جاگتی ہے۔ ہوٹل والے کسی سیاح کو ویرانی' سناٹے' بے رونقی اور تنہائی کی شکایت کا موقع نہیں دیتے۔

سب سے بڑے' سب سے طویل اور سب سے زیادہ نیلے ساحل یہیں ہیں۔ اس علاقے میں خلیج مقبرہ بھی ہے۔ ماریشس کے مقامات کے جتنے بھی نام ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی بے معنی ہو۔ خلیج مقابر دراصل وہ علاقہ ہے جہاں جہاز غرق ہو جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تو' غالباً ۱۶۱۵ء میں ایک ولندیزی گورنر بھی اپنے جہاز کے ساتھ ڈوب مرا تھا چنانچہ پورٹ لوئس کے پچھواڑے جس پہاڑ کی نوکیلی چوٹی کے اوپر ایک گول سی چٹان یوں ٹکی ہوئی ہے جیسے ہندوستان کا نقشہ الٹ دیا گیا ہو اور سری لنکا بالائی نوک پر ٹکا ہوا ہو' اس پہاڑ کا نام اسی ولندیزی گورنر کے نام پر رکھ دیا گیا' بعد میں جزیرے میں یہ پیشین گوئی چل پڑی کہ جس روز ماریشس میں برطانوی حکمرانی کا خاتمہ ہو گا' نوکیلی چٹان کے شانوں سے دھرا ہوا یہ سر نیچے آ رہے گا۔

برطانوی حکمرانی ختم تو ہو گئی ہے' ممکن ہے صرف دیکھنے میں ختم ہوئی ہو۔ کیونکہ وہ سر آج تک وہیں ٹکا ہوا ہے۔

خلیج مقابر میں پرانے زمانے کے اتنے جہاز ڈوب چکے ہیں کہ غوطہ زن آج تک وہاں سمندر کی تہہ میں خزانے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بحری قزاقوں نے بھی وہاں خزانے دفن کئے تھے۔ وہ لوگ بھی ساحلی ریت ٹٹولا کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ

آج تک کسی کو وہاں سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملی۔

اس علاقے میں فرانسیسی دور کے کھنڈر بہت ملتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرانسیسیوں کے اسلحہ خانے، آٹا مل اور چونے کی بھٹی کے کھنڈر ہیں جن کے اوپر اب سبزہ اگ آیا ہے اور جن کے اطراف چشمے بہتے ہیں اور جھرنے گرتے ہیں۔ کچھ دور شکر سازی کے کارخانے کے کھنڈر ہیں۔ وہاں سے دور تک گنے کے کھیت اور ان میں قطار در قطار بنے ہوئے پتھروں کے اہرام نظر آتے ہیں۔

اس جگہ ساحل سے پرے کئی جزیرے بھی ہیں۔ وہاں جانے والی کشتیوں کے پیندے شفاف شیشے کے ہیں۔ ذرا تصور کیجئے کہ ان جھروکوں سے نیلے سمندر کی گہرائی کیسی نظر آتی ہو گی۔ ان جزیروں کے بارے میں سائنسدان کہتے ہیں کہ ان میں ایسے جانور اور درخت موجود ہیں جو دنیا میں کہیں اور نہیں ہوتے اور یہاں بھی ان کا چل چلاؤ ہے۔ حکومت بڑے جتن کر رہی ہے کہ یہ نادر مخلوق تباہ ہونے سے بچ جائے۔ انیسویں صدی میں کسی نادان نے بکریاں اور خرگوش وہاں پہنچا دیئے تھے جنہوں نے جاتے ہی عجوبہ روزگار درختوں اور پودوں پر منہ مارا۔ بڑی مشکل سے انہیں ختم کیا گیا ہے۔ چوہے ان جزیروں میں کبھی نہیں پہنچ سکے لہٰذا بعض پھل، بیج اور جڑیں آج تک سالم ہیں۔ ان جزیروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں سیاح نہیں جاتے، سائنسدان جاتے ہیں۔

ماریشس کی انتہائی شمالی نوک کا نام بھی دلچسپ ہے: راس بدنصیبی! کہتے ہیں کہ یہاں سمندری جہاز ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش

ہو جایا کرتے تھے۔ اب سمجھ میں آیا کہ براعظم افریقہ کے جنوبی گوشے کا نام راس امید کیوں ہے۔ وہاں پہنچ کر مغرب کے جہاز رانوں کی امید بندھ جاتی تھی کہ اب ہندوستان دور نہیں۔

شمالی ماریشس کے اس سفر کے دوران گڈ لینڈز کا قصبہ بھی راہ میں آیا۔ حیرت ہے یہ نام فرانسیسی زبان میں کیوں نہیں۔ گڈلینڈز میں ہندوؤں کا ایک بڑا مندر ہے اس لئے وہاں بھی سیاح نہیں جاتے' پجاری جاتے ہیں۔

اس علاقے میں دبے ہوئے اور پانی میں ڈوبے ہوئے خزانوں کی کہانیاں بہت عام ہیں۔ یہیں وہ لکھ پتی ہندوستانی خاندان آباد ہے جن کے دادا کا دادا کھیتوں میں مزدوری کرنے آیا تھا۔ وہ واحد ہندوستانی محنت کش تھا جسے پتھروں کے نیچے واقعی سونے کے سکے ملے تھے۔ یعنی کوئی دبا ہوا خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اب یہ لوگ نہ صرف زمینوں اور کھیتوں کے مالک ہیں بلکہ بڑے تاجر اور کارخانے دار بھی ہیں۔

ذرا آگے چل کر پامپل موزز کا گاؤں ہے۔ اس لفظ کا مطلب ہے: چکوترا۔ کہتے ہیں کہ ولندیزیوں نے جاوا سے چکوترے کا درخت لا کر یہاں لگایا تھا۔

علاقوں کے نام رکھنے کے یہ لوگ کیسے کیسے دلچسپ بہانے ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔

یہیں ماریشس کا مشہور و معروف سر سیوساگر رام غلام بوٹینکل گارڈن (چڑیا گھر اور عجائب گھر کی طرح پودہ گھر) ہے جو ساڑھے تین

سو سال پہلے گورنر کے محل کے لئے سبزیاں اگانے کی خاطر قائم کیا گیا تھا۔ پھر یہاں مصالحوں کے درخت لگانے کی کوشش کی گئی بالآخر بیسنکڑوں قسم کے پام کے درخت اگائے گئے۔ ماریشس کے طوفان کے سامنے جم کر اگنے والے گنے کی نسل بھی یہیں تیار ہوئی اور ۱۸۶۶ء میں جب ملیریا کے مچھروں نے تباہی مچانے میں طوفانوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تو دلدلی علاقوں کی رطوبت جذب کر جانے والے درخت بھی یہیں اگائے گئے۔ یہ علاقے خشک ہوئے تب کہیں مچھروں کی افزائش کم ہوئی۔ سنا ہے کہ اب بھی خوب ہوتے ہیں اور گنے کے کھیتوں کے مالک کی روایت قائم رکھے ہوئے ہیں جو اپنے غلاموں کا خون چوسا کرتے تھے۔

سر سیو ساگر رام غلام بوٹینکل گارڈن کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دے دیا جائے تو عجب نہ ہو گا۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ اسے تفصیل سے دیکھنے کے لئے لوگ باغ کے نقشے خریدتے ہیں، کتابیں لیتے ہیں اور وہاں لگے ہوئے اس نوٹس کے باوجود کہ کسی گائیڈ کی خدمات حاصل نہ کریں، وہ گائیڈ کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں۔ دنیا زمانے کے بے کار نوجوان اپنے آپ کو باغ کا گائیڈ مقرر کر کے سیاحوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ عالم ہوتا ہے کہ جس طرح بھیک مانگنے والوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے انہیں بھیک دے دینے میں عافیت ہے، اس طرح ان بوٹیاں نوچنے والے رہنماؤں کے ہجوم سے نجات پانے کے لئے ایک لڑکے کو بطور گائیڈ ہمراہ لے لینے میں نجات ہے۔

اس باغ کی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پھولوں کا نہیں' درختوں کا باغ ہے۔ پھول تو یہاں برائے نام ہیں لیکن جو ہیں انہوں نے خوب نام پایا ہے آپ بوٹینکل گارڈن جانے لگیں تو جزیرے والے آپ کو یہ ضرور بتاتے ہیں کہ وکٹوریا نامی کنول ضرور دیکھ لینا جو ایک روز کھلتا ہے تو بالکل سفید ہوتا ہے اور دوسرے روز سرخ ہو کر مرجھا جاتا ہے۔ یہیں پام کے وہ درخت بھی ہیں جن پر پچاس ساٹھ برسوں میں ایک بار پھول آتے ہیں۔ جو لوگ انہیں دیکھنے کے مشتاق ہوں اور دیکھنے سے رہ جائیں۔ پھر ان کی روح کو ایصال تشفی کے لئے ان کے پوتے پوتیاں وہ پھول دیکھنے جاتے ہیں۔

باغ کے ایک حصے میں خوشبودار درخت ہیں' مثلاً ادرک' الائچی' جوتری' یوکلپٹس' صندل' لیموں اور مختلف مصالحوں کے درخت' ان کے درمیان چلئے تو کسی ایسے پنساری کی دکان میں چلنے کا گمان ہوتا ہے جو اپنے مال میں ملاوٹ نہیں کرتا۔

یہیں جانوروں کا محفوظ علاقہ بھی ہے۔ یہیں ماریشس کے ہرن قلانچیں بھرتے ہیں اور غلہ بھری بوریوں سے بھی بڑے کچھوے اپنی مخصوص چال چلا کرتے ہیں۔ یہیں وہ بوڑھا کچھوا بھی ہے جس کو جگانے کے لئے کسی سیاح نے اس کے خول پر پتھر پھینکا تھا اور خول میں شگاف پڑ گیا تھا سیاح پر پانچ سو روپے جرمانہ ہوا تھا اور کچھوؤں کے تالاب کے گرد منڈیر بنا دی گئی تھی۔

آزادی کے بعد مقرر ہونے والے ماریشس کے پہلے وزیراعظم سر سیوساگر رام غلام نے وفات پائی تو ان کی میت یہیں' اس باغ میں

سیمنٹ کے ایک چبوترے پر نذر آتش کی گئی۔ سنا ہے ان کی راکھ ہندوستان لے جا کر دریائے گنگا کے اوپر بکھیری گئی۔
سچ ہے' ان کی راکھ وہیں پہنچی جہاں کا خمیر تھا۔
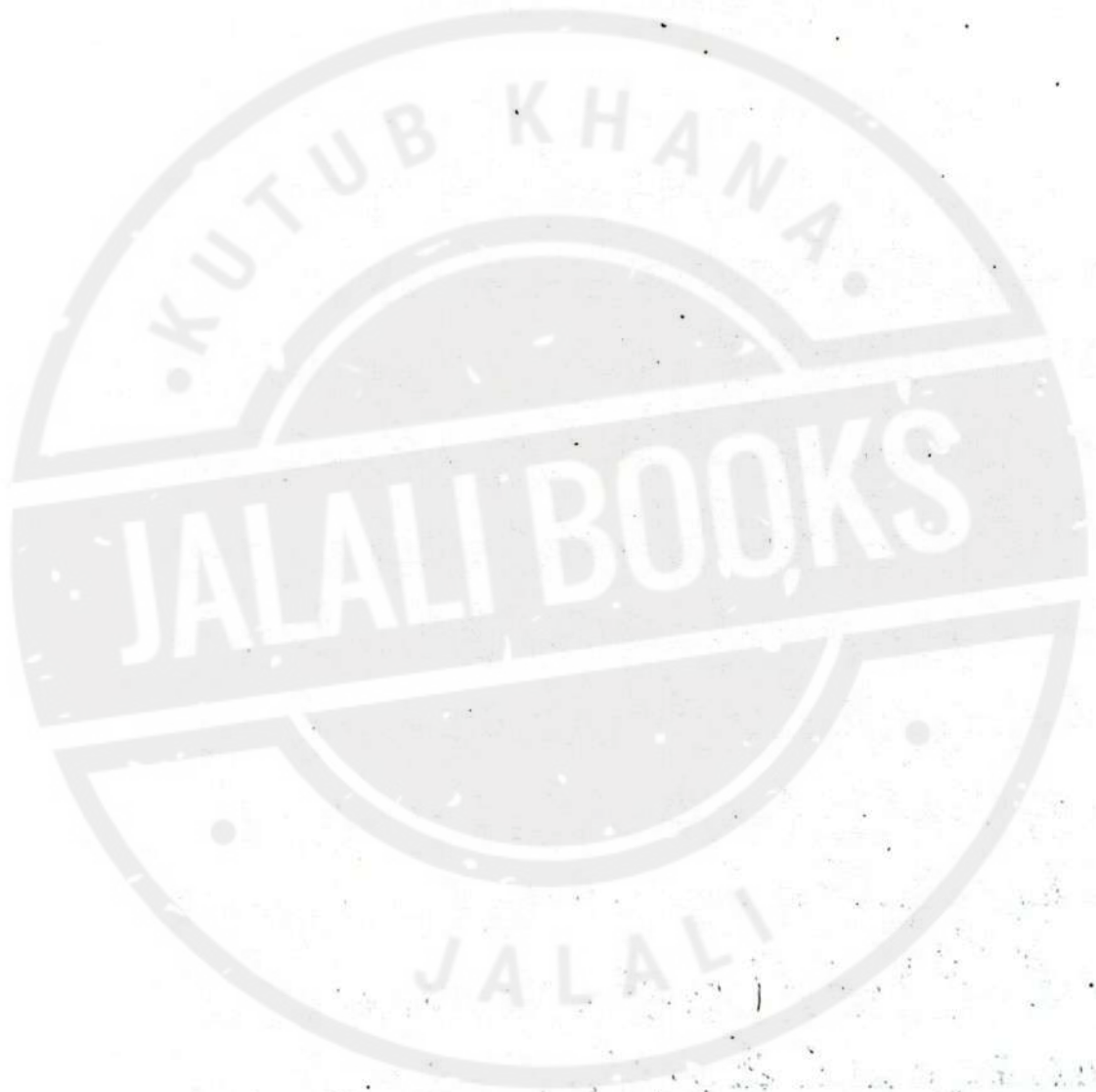
کھانے کا قصہ پینے کی کہانی

ماریشس والے بھی عجیب ہیں۔

پھل کھانے کے معاملے میں ان جیسا کوئی نہیں ہو گا۔ پپیتا اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے کہ کہیں مٹھی بھر بیج ڈال دیں تو پورا باغ اگ آئے۔ ہر نکڑ پر پپیتے کے جھنڈ نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب تیار ہوتا ہے تو دھوپ میں سونے کی طرح چمکتا ہے اور جتنی اچھی رنگت ہوتی ہے اتنا ہی عمدہ ذائقہ ہوتا ہے۔ بس یہ ہے کہ کھاتے نہیں۔ پکے ہوئے پپیتے پر چڑیاں ٹھونگیں مارتی رہتی ہیں اور اگر آپ راہ گیر ہیں اور کسی کے باغیچے میں لگے ہوئے پپیتے آپ توڑنا چاہیں تو نہ صرف یہ کہ آپ کو پوری آزادی ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ سرقے کے اس عمل کے دوران صاحب خانہ باہر آ کر آپ کا شکریہ بھی ادا کریں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ درختوں پر پکنے کے بعد جو پپیتے پرندوں سے بچ جاتے ہیں وہ گر کر اور گل سڑ کر خود ہی خاک میں مل جاتے ہیں۔

ہم جن دنوں وہاں تھے' پچھلے طوفان نے پپیتے کے سارے درخت گرا دیئے تھے۔ ہمارا اشتیاق دیکھ کر کسی نے کھانے کے بعد

پپیتے پیش کیے۔ رنگت سونے کی تھی اور سنا ہے کہ قیمت بھی۔

یہ اس ملک کا ذکر ہے جہاں ایک پورے علاقے کا نام پلین دے پاپایا، یعنی پپیتے کا میدان۔

یہی حال آم کا ہے۔

ظاہر ہے کہ جہازی بھائی کلکتے، بمبئی اور مدراس کے ساحلوں سے اپنے ساتھ آم ضرور لائے ہوں گے۔ انہیں ماریشس کی زمین خوب راس آئی اور اس کثرت سے اگا کہ گرمیوں کے شروع میں پورے جزیرے میں بور مہکتا ہے۔ پھر جب آم تیار ہوتا ہے تو بوجھ سے شاخیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ لیکن انجام پپیتے جیسا ہوتا ہے۔ کھاتے ہیں لیکن خیال رکھتے ہیں کہ کہیں اشتیاق کا اظہار نہ ہو جائے۔ شہروں میں تو سنا ہے کہ قیمتاً مل جاتا ہے مگر گاؤں دیہات میں آم بیچنے یا خریدنے کا رواج نہیں۔ پال نہیں ڈالتے۔ شاخ پر پکتے ہیں، وہیں سے ٹپکتے ہیں اور قدر دانوں کی حسرت لئے وہیں خاک ہو جاتے ہیں۔

املی کے بارے میں کہنا مشکل ہے کہ پھلوں میں شمار ہوتی ہے یا نہیں، لیکن قدرت نے املی کے معاملے میں بھی یہاں اتنی زیادہ فیاضی سے کام لیا ہے کہ ایک پورے علاقے کا نام پلین دے تمرین یعنی املی کا میدان ہے لیکن شاخ پر پک پکا کر اور گر کر ضائع ہو جاتی ہے۔ خود کھانے کے لئے دوسرے ملکوں سے درآمد کرتے ہیں۔ تو پھر کیا کھاتے ہیں؟ پھلوں سے رغبت ہے یا نہیں؟

جی ہاں، خوب ہے۔ میں نے کسی سے پوچھا تو ترنت جواب ملا۔ بہت شوق سے کھاتے ہیں لیکن ضروری ہے کہ وہ پھل باہر سے

آیا ہو، کسی بیرونی ملک سے درآمد کیا گیا ہو۔ سیب، ناشپاتی اور سنگترہ خوش ہو ہو کر کھاتے ہیں لیکن یہ سارا پھل جنوبی افریقہ اور دوسرے ملکوں سے آتا ہے۔

کھانے پینے کا ذکر چل نکلا تو اب ذرا پینے کا حال سن لیجئے۔

اچھی سے اچھی دودھ دینے والی گائے لا کر رکھی گئی مگر اس کا دودھ نہیں پیتے۔ ڈبے کا دودھ پیتے ہیں۔ میرا مطلب کہ وہ گاڑھا اور میٹھا دودھ جو ٹین کے ڈبوں میں آتا ہے۔ صرف کچھ خوش مذاق لوگ اصلی اور تازہ دودھ استعمال کرتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ دہی جماتے ہیں اور سمندر پار سے آئے ہوئے پھل کوٹ کر اس میں ملا کر کھاتے ہیں اور چونکہ بریانی کا بہت شوق ہے، اس کے ساتھ دہی کا رائتہ بناتے ہیں۔

گنا زمین سے ابلا پڑتا ہے لیکن گنے کا رس نہیں پیتے البتہ گنے کی شراب اتنے ہی ذوق و شوق سے لنڈھاتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ پرلے درجے کے کاہل ہیں، گھر میں پڑے ٹیلیویژن دیکھتے رہتے ہیں اور شراب پیتے رہتے ہیں۔ مجھے ایک عجب بات بتائی گئی، ایسی عجب بات کہ مجھے یقین نہیں آیا اور کئی جگہ سے میں نے تصدیق چاہی اور وہ بات درست نکلی: ماریشس کی حکومت نے شراب پر لگا ہوا ٹیکس ختم کر دیا ہے۔ دنیا بھر کی حکومتیں اپنے خسارے پورے کرنے کے لئے سگریٹ اور شراب پینے والوں ہی کو نچوڑتی ہیں لیکن یہ ملک وہ عجوبہ روزگار ہے جہاں شراب پر ٹیکس معاف کر دیئے گئے ہیں۔ میرے احباب نے بتایا کہ پہلے جو لوگ ایک بوتل خرید کر گھر لے جایا کرتے

تھے' اب وہ بوتلوں سے بھرے کریٹ لے جاتے ہیں۔ گنے کی رم "گرین آئی لینڈ" صرف سو روپے کی ہے اور دوسری مقامی شرابیں اس سے بھی سستی ہیں۔ اور اگر گزرتے ہوئے فیکٹری سے خریدیں تو اور بھی سستی مل جاتی ہیں۔

'گرین آئی لینڈ' پر انہیں بڑا ناز ہے۔ کہتے ہیں کہ گنے کی شراب اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ سیاح بطور سوغات لے جاتے ہیں۔ یہ مشروب اتنے ارزاں ہیں کہ ہوائی اڈے کی ڈیوٹی فری دکانیں انہیں بیچنے کی زحمت نہیں کرتیں۔

ہم لوگ جزیرے کی سیر کرتے ہوئے ایک ساحلی سڑک سے گزر رہے تھے اور راستے میں جگہ جگہ گاؤں آ رہے تھے۔ ایک گاؤں آیا تو دیکھا کہ لوگ ادھر ادھر بیکار بیٹھے ہیں۔ اور اکثر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہیں۔ ہمارے میزبان نے بتایا کہ اس گاؤں میں تعلیم بہت کم ہے۔ کار میں موجود سارے اجنبی ایک ساتھ بولے —— "کیوں؟"

جواب ملا۔ "یہ سب لوگ نشے کے عادی ہیں۔ پورا گاؤں شرابی ہے۔ اس لئے انہیں پڑھنے لکھنے سے دلچسپی نہیں۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ملی جلی نسل کے باشندے تھے اور غالباً سارے کے سارے عیسائی تھے۔

یہ تو ہوئی شراب پینے کی بات۔ یہی حال شکر کا ہے۔

شکر اس کثرت سے پیتے ہیں کہ بس چلے تو چمچے سے نہ ڈالیں بلکہ شکر دانی سے انڈیلیں۔ پھر خود ہی ہنستے ہیں' شرمندہ ہوتے ہیں اور خود ہی کہتے ہیں کہ ماریشس میں شکر کا مرض بہت عام ہے۔ یہاں کے

بہ در تک ذیابیطس کے مریض ہیں۔

میرا خیال تھا کہ جس طرح زمین سے گنا ابلا پڑتا ہے' چاروں طرف پھیلے ہوئے نیلگوں سمندر سے مچھلی ساحل پر چڑھی چلی آتی ہو گی' لیکن جب کئی روز کھانے پر مچھلی نہیں ملی تو پتہ چلا کہ مہنگی بہت ہے۔ میرا خیال تھا کہیں اور چلی جاتی ہو گی' اس طرف نہیں آتی ہو گی لیکن ایک روز حال کھلا کہ ساری مچھلی غیر ملکی سیاح کھا جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں والے عمدہ مچھلی کے اتنے زیادہ دام لگاتے ہیں کہ مچھیرے شہروں کا رخ ہی نہیں کرتے۔ شاید ان ہی کی سہولت کے خیال سے سارے بڑے ہوٹل سمندر کے کنارے بنائے گئے ہیں۔

ان کے کھانوں میں بریانی کا جواب نہیں۔ میں نے اس قسم کی بریانی ملاباری بریانی کے نام سے کھائی ہے۔ باسمتی چاول میں مرغی' گول آلو' انڈے اور ہرا دھنیا ڈالتے ہیں۔ غالباً قورمے کا مصالحہ ہوتا ہے اور مقدار میں کافی ہوتا ہے اس لئے بریانی مین کچھ اور نہیں ملاتے۔ بس یوں ہی کھا لیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت مزے کی ہوتی ہے۔

ماریشس میں یہ بات سوا لاکھ روپے کی ہے کہ غریب ہوں یا امیر' شادی کی تقریب میں ایک یہی بریانی کھلاتے ہیں۔ یہی حال بچے کی ولادت' بزرگوار کی وفات' عرس' قرآن خوانی' مشاعرہ' محفل غزل اور قوالی کا ہے۔ ہمارے دوست عنایت حسین عیدن کہتے ہیں کہ یہاں ووٹ لینے کے لئے اور رشوت دینے کے لئے بھی بریانی کھلائی جاتی ہے۔

بڑی بڑی دعوتوں کے لئے بریانی پکانے والے باورچی یہاں بھنڈاری کہلاتے ہیں۔ بعض بھنڈاریوں کی بڑی شہرت ہے کیونکہ وہ نہایت عمدہ بریانی پکاتے ہیں۔ خراب بریانی پکانے والے کے لئے جزیرے میں کوئی جگہ نہیں۔ سنا ہے کہ بریانی خراب ہو جائے تو بھنڈاری چپکے سے پچھلے دروازے کے راستے بھاگ جاتا ہے۔

واقعی ماریشس والے عجیب ہیں۔

فٹ بال کے دیوانے ہیں۔ میچ برطانیہ میں ہو' یہ پورٹ لوئس میں تالیاں بجاتے ہیں۔ پسندیدہ ٹیم امریکہ میں ہار رہی ہو' یہ موکا میں آنسو بہاتے ہیں۔ فٹ بال کے رسالے پڑھتے ہیں' پول بھرتے ہیں۔ اپنی پسندیدہ ٹیموں کے نام سے کلب بناتے ہیں چاہے وہ ٹیم برطانیہ کی ہو چاہے ارجنٹینا کی۔ سنا ہے کہ جن دنوں امریکہ میں عالمی کپ کے مقابلے ہو رہے تھے' یہ لوگ کام سے چھٹی لے کر گھروں میں بیٹھ گئے تھے اور دن دن بھر ٹیلیویژن پر میچ دیکھا کرتے تھے چنانچہ ملک کی صنعتی پیداوار گھٹ کر آدھی رہ گئی۔

اپنی ایک اور عادت کا احوال بہت مزے لے لے کر سناتے ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ کوئی نیا کام شروع ہو' نیا پارک بنے یا نیا اسٹور کھلے' دیوانوں کی طرح ہزاروں کی تعداد میں وہاں پہنچ جاتے ہیں مگر چند روز میں اکتا کر وہاں جانا چھوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً کوئی نیا ریسٹورنٹ کھلا اور اگر کہیں اس نے دام گھٹانے کا اعلان بھی کر دیا تو غول کے غول وہاں پہنچنے لگیں گے مگر اچانک ایک دن سناٹا چھا جائے گا اور وہاں اُلّو بولنے لگیں گے۔

اس کا نظارہ ہم نے بھی کیا۔ جس راستے سے ہمارا روز کا آنا جانا تھا وہاں ایک بڑے میدان میں کانٹی نینٹل ہائپر مارکیٹ کھلی تھی جس کے گرد سینکڑوں کاریں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ اوپر سے مارکیٹ والوں نے کہہ دیا کہ ہر چیز کی قیمت پندرہ فی صد کم ہے۔

اب یہ ہوا کہ جہاں سینکڑوں کاروں کے سمانے کی جگہ تھی، وہاں ہزاروں کاریں پہنچنے لگیں۔ جزیرے کے کونے کونے سے خلقت وہاں ڈھلنے لگی۔ آگے آگے بچے، ان کے پیچھے ماں باپ اور ان کے پیچھے بوڑھے دادا دادی قطار در قطار ہائپر مارکیٹ کی طرف چل پڑے۔ اس مارکیٹ کا ایک کمال تھا کہ جس ملک میں ہر چیز شام چھ بجے تک بند ہو جاتی ہے وہاں یہ مارکیٹ رات دس بجے تک کھلنے لگی۔ ماریشس والوں کو یہ عجوبہ اتنا اچھا لگا ہے کہ رات دس بجے ان کی خوشامدیں کی جاتی ہیں کہ خدا کے لئے اب گھر جایئے مگر یہ نہیں جاتے۔ پھر انہیں سمجھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد تنبیہہ کی جاتی ہے۔ اور آخر میں زور زبردستی سے انہیں نکالا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے کہ ماریشس کے ہزاروں لوگوں کی طرح ان کا نام بھی فاروق تھا، ہمیں بتایا کہ ایک شام سات بجے وہ اپنے بچوں کو لے کر ہائپر مارکیٹ گئے تو پولیس نے انہیں باہر ہی روک دیا اور کہا کہ اندر جانے کی اجازت نہیں کیونکہ اندر پہلے ہی پچیس ہزار آدمی بھرے ہوئے تھے۔

بڑی مشکل سے فاروق اور ان کے بال بچے اندر داخل ہوئے اور اتنی بھیڑ بھاڑ میں ان سے کچھ بھی خریدا نہ گیا۔ بچے بھوکے تھے

انھوں نے بسکٹ کے کچھ پیکٹ اٹھا لئے اور قیمت ادا کرنے کے لئے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ خدا خدا کر کے جس وقت قیمت ادا کرنے کی باری آئی اس وقت تک بچے نہ صرف سارے بسکٹ کھا چکے تھے بلکہ منہ بھی پونچھ چکے تھے۔

فاروق صاحب جب یہ قصہ سنا چکے تو بولے کہ آپ نے دیکھا ہو گا ماریشس میں جن لوگوں کا نام فاروق ہے، سب دیکھنے میں غریب غربا نظر آتے ہیں۔ بڑے بوڑھے اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فاروق نام کے لوگوں کے لئے جتنی دولت اٹھا کر الگ رکھی تھی وہ ساری کی ساری مصر کے شاہ فاروق کے حصے میں چلی گئی۔

مطلب یہ کہ بھلے لوگ ہوتے ہیں۔ صاف ستھرے بہت رہتے ہیں اور اپنے گھر گھروندے بھی صاف رکھتے ہیں۔ اکثر جھاڑو دیتے رہتے ہیں لیکن غلامی کی رسموں سے اتنے تنگ آ چکے ہیں کہ جھاڑو دینے کے لئے جھکتے نہیں۔ ایک لمبے سے ڈنڈے کے آگے برش باندھتے ہیں اور دوسرے ڈنڈے کے سرے پر ٹین لگاتے ہیں۔ بس کھڑے کھڑے ایک ہاتھ سے جھاڑو دیتے جاتے ہیں اور دوسرے سے کوڑا کرکٹ سمیٹتے جاتے ہیں۔

ایک روز جنوبی ہند کی صورتوں والی خواتین ہمارے ہوٹل کے زینے مانجھ رہی تھیں۔ انہوں نے ناریل کے جوتے بنا رکھے تھے جنہیں پیروں تلے دبا کر وہ کھڑے کھڑے فرش کی منجھائی کر رہی تھیں۔

اس ساری صفائی ستھرائی کے باوجود مجھے ایک عجیب تجربہ ہوا۔

ماریشس پہنچتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہوا میں تیل کی بو ہے۔ وہی تیل جس میں کھانا پکایا جاتا ہے۔

میں نے اپنے میزبانوں سے پوچھا کہ ماریشس والے کھانا کس تیل میں پکاتے ہیں۔

انہوں نے عام تیلوں کے نام بتا دیئے۔

میں نے کہا کہ مجھے یہاں آئے ہوئے دو دن ہو گئے ہیں اور دو دن سے ہوا میں تیل کی سی بو ہے۔

ان سب نے زور زور سے سانسیں کھینچیں اور مل کر گردنیں ہلا دیں۔ "یہاں تو کوئی بھی بو نہیں ہے۔"

میں نے کہا —— "ہے۔"

لیکن تیسرے دن میری 'ہے' میں کمی آئی' چوتھے روز بہت ذرا سی 'ہے' رہ گئی اور پانچویں دن میں جزیرہ ماریشس کی ہوا کی بو کا عادی ہو گیا۔ کسی نے پوچھا کہ کیا اس تیل کی بو ابھی تک آ رہی ہے؟ میں نے کہا کہ مہمان کی طبع نازک کے خیال سے شاید اہل ماریشس نے راتوں رات کسی اور تیل کا استعمال شروع کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب میں لندن لوٹ آیا تو وہاں کے دھلے ہوئے کپڑوں سے پھر اسی تیل جیسی بو آنے لگی۔

میرا خیال ہے کہ ہر سرزمین کی اپنی علیحدہ بو ہوتی ہے۔

اسی دوپہر مجھے ذرا فرصت ملی تو میں بازاروں کی سیر کو نکل گیا مجھے پتہ تھا کہ پانچ بجے ہی یہ لوگ دکانوں میں تالے ڈال کر گھروں کو

چلے جائیں گے۔

بازار اسکولوں کے نوجوانوں سے بھرے ہوئے تھے' یا پھر کچھ عورتیں خریداری میں مصروف تھیں۔ جزیرے کا تقریباً ہر شخص برسرروزگار ہے اس لئے بازاروں میں وہ ہندوستان جیسا حال نہ تھا۔

میں مقامی موسیقی کے کچھ کیسٹ خریدنا چاہتا تھا۔ ایک دکان میں پہنچا جو ہندوستانی گانوں سے بھری پڑی تھی۔ دیواروں پر پوسٹر بھی عامر خان اور ڈمپل کپاڈیہ کے لگے ہوئے تھے۔ دکان دار سمجھے کہ میں بھی محمد رفیع اور لتا منگیشکر کے گانے مانگوں گا لیکن جب میں نے خالص ماریشس کے بھوج پوری گانوں کی فرمائش کی تو وہ حیران رہ گئے۔ پھر بھی انہوں نے بہت سے کیسٹ نکال کر میرے سامنے چن دیئے جن کے عنوان میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔

مثلاً سولہ برس کی چھوکریا۔

میں نے فوراً خرید لی۔

شام کو عبداللہ احمد صاحب نے چائے پر بلایا تھا۔ اچھے سے ہوٹل میں اچھی سی چائے تھی ورنہ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کی کینٹین میں خالص عوامی چائے ملی تھی۔ بدمزہ پتی' تھوڑا سا پانی' بہت سی شکر اور اس سے بھی زیادہ دودھ اور وہ بھی ٹین کا۔

چائے کے بعد عبداللہ احمد صاحب نے اپنی کار میں مجھے میرے ہوٹل لے جانے کی پیش کش کی وہ میں نے یوں بھی قبول کرلی کہ غضب کی گھٹائیں آرہی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ ٹوٹ کے برسیں گی۔

ذرا آگے چلے تو عبداللہ احمد صاحب کی بیٹی نے چونکایا۔ "وہ دیکھیے۔ دھنک"

دیکھی۔ ایسی مکمل' ثابت اور سالم دھنک میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ساتوں رنگ ایک گنے کے کھیت سے بلند ہو رہے تھے اور پورا دھنش بناتے ہوئے میلوں دور کسی دوسرے کھیت میں اتر رہے تھے۔ میں نے یاسمین کو بتایا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ جس جگہ دھنک زمین کو چھوتی ہے وہاں خزانہ دبا ہوتا ہے؟"

"نہیں۔ یہ میں نے کبھی نہیں سنا۔ یہ بات ہے تو ماریشس کی زمین میں بہت سے خزانے دفن ہوں گے کیونکہ یہاں دھنک بہت نکلتی ہے۔ یہ جزیرہ اپنی ---- دھنک کی جمع کیا ہوتی ہے؟"

میں نے سن رکھا تھا کہ یہ جزیرہ اپنی دھنکوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ہندوستان سے یہاں صرف کھیت مزدور آئے تھے۔ اگر پٹواری بھی آئے ہوتے تو سڑکات اور درختات کی طرح دھنک کی جمع دھنک جات ہوتی۔

ہم ذرا آگے چلے تو انگریزوں کی چھاؤنی کا علاقہ آگیا کہیں پرانی توپیں عرصے سے کھڑے کھڑے زمین میں دھنس گئی تھیں۔ کہیں قدیم جہازوں کے لنگر رکھے تھے۔ پھر انگریزوں کا کلب آیا' گالف کے میدان آئے اور گورا پلٹن کی بیرکیں آئیں جن کے گیٹ پر سنا ہے عیدی امین کھڑے رہا کرتے تھے اور ہر آتے جاتے کو سلیوٹ کرتے تھے اور ملکہ برطانیہ کی تصویر دیکھ پاتے تو زیادہ ہی زور سے سلامی دیتے تھے۔

یوں ہی سلام کرتے کرتے وہ یوگنڈا کے صدر ہو گئے۔
قسمت اگر واقعی ہوتی ہے تو عجیب طرح سے کام کرتی ہے۔

لوغاؤ 'لوغاؤ

ایک دن بڑی محفل جمی ہوئی تھی۔ سارے احباب اور ان کی بیویاں میرے گرد گھیرا ڈالے میری باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ جزیرے میں بسنے والے لوگ شاید ہر روز ملتے ہیں تو وہی ہر روز جیسی باتیں کرتے ہوں گے۔ میں باہر سے آیا تھا تو غالباً نئی نئی باتوں کی سوغات لایا تھا۔

خواتین کی دلچسپی کے خیال سے میں نے باتوں باتوں میں پروین شاکر کا وہ مصرعہ پڑھا

دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

میرا یہ مصرعہ پڑھنا تھا کہ خواتین کھلکھلا اٹھیں اور ان میں سے کسی کی آواز آئی۔ "یہاں ماریشس میں تو کھل جاتی ہیں۔"

ایک روز فاروق پوچا صاحب سے باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ ماریشس کے نوجوانوں کے جذباتی مسائل کے بارے میں بتا رہے تھے۔ کہنے لگے کہ پانچ سال پہلے تک لڑکے لڑکیاں ایک ہی اسکول میں پڑھا کرتے تھے لیکن پھر ان کے جذباتی مسئلے اتنے بڑھے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلیمی ادارے الگ الگ کرنے پڑے۔

عجیب بات یہ ہے کہ ماریشس کے معاشرے میں فرانسیسی اثرات بنیادوں میں اترے ہوئے تھے۔ ان کے بعد انگریز آئے جو ہر ایک کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ اس کے باوجود لڑکیاں لڑکے ایک ہی جماعت میں بیٹھتے تھے۔ نہ ان کے دل زور زور سے دھڑکتے تھے، نہ سانسیں تیز تیز چلتی تھیں۔

لیکن ادھر غیر ملکی حکمران گئے اور آزادی آئی، ادھر جذبات بھی آزاد ہونے لگے۔ دلوں کے سادہ ورق پر مغربی سماجی اثرات نے یلغار کر کے پہلا نقش ثبت کر دیا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا۔ وہ قدیم روایات سے چمٹے ہوئے تھے۔ ان پر دو مصائب ایک ساتھ آئے: اول تو مغربی رسالے، کتابیں، فلمیں، ویڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام آئے، دوسرے وہ مولوی آئے جنہوں نے زندگی میں پہلی بار ماریشس کے مسلمانوں کو بتایا کہ تم دیوبندی ہو، تم بریلوی ہو، تم اہل حدیث ہو اور یہ کہ ہم نے پیمائش کر کے دیکھا ہے، تمہاری مسجدوں کے رخ درست نہیں اور یہ کہ سو برس سے تمہاری نمازیں ضائع ہو رہی تھیں۔

چنانچہ دین کے یہ رہبر قدیم مسجدوں کی محرابیں سیدھی کرنے میں لگ گئے ادھر جدید تعلیم پانے والے نوجوان ٹیڑھی راہوں پر چل پڑے۔

خود ماریشس والے زور دے کر کہتے ہیں کہ مسلمان نوجوانوں کی دینی تعلیم نہیں رہی۔ لڑکے اردو نہیں سمجھتے اور تبلیغ کرنے والے کریول یا انگریزی فرانسیسی نہیں بول سکتے۔

دین میں اختلاف کا یہ عالم ہے کہ زمانہ قدیم سے ماریشس والوں کا خیال تھا کہ بس کچھ مسلمان ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں اور کچھ ہاتھ کھول کر۔ اب صورت حال یہ ہے کہ میں ماریشس کے ایک گاؤں میں گیا جس کے نام کا صحیح تلفظ بری زے۔ وی - آر - جے - اے ہے۔ لب سڑک ایک نہایت خوش نما مسجد نظر آئی۔ اس کے پہلو میں جو گلی تھی اس کا نام مسجد روڈ تھا۔ میں ابھی خوش ہو کر گاؤں والوں کو بتا ہی رہا تھا کہ کتنی دیدہ زیب مسجد ہے اور کتنی اچھی بات ہے اس پوری آبادی کے لئے بس ایک ہی مسجد ہے۔ میری اس بات پر گاؤں والے کچھ شرمندہ سے نظر آئے اور کہنے لگے کہ جی ہاں۔ پرانے زمانے سے یہاں بس یہی ایک مسجد تھی۔ اب اس چھوٹی سے بستی میں پانچ مسجدیں ہو گئی ہیں۔ پہلے اس ایک مسجد میں ایک سو نمازی آتے تھے۔ اب کسی میں دس آتے ہیں کسی میں پندرہ۔

میں نے سوچا کہ چل کر کسی مسجد کے پیش امام سے پوچھا جائے کہ ماریشس کے نوجوانوں پر کیا گزر رہی ہے۔ ان کی رہنمائی کے لئے مسجد کس طرح اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ مسجد اور نوجوانوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے اور مستقبل اپنے ساتھ کیسے کیسے منظر لا رہا ہے۔

روز ہل ماریشس کا بہت بارونق اور آباد علاقہ ہے۔ وہیں سنی مسجد بھی ہے جو ۱۸۶۳ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس وقت اہل ماریشس بس ان ہی دو اصطلاحوں سے واقف تھے: شیعہ اور سنی۔

مسجد قدیم طرز کی تھی۔ سادہ سی۔ مستحکم سی۔ اس وقت کھلی

ہوتی تھی کیونکہ دوپہر کو نماز جمعہ ہونے والی تھی۔ مسجد کی عمارت ہی میں انجمن امداد غربا کا دفتر بھی نظر آیا۔ باہر جتنا بڑا بورڈ لگا تھا' دروازے پر اتنا ہی بڑا تالا پڑا ہوا تھا۔ کچھ گداگر باہر بیٹھے نمازیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

۱۳۰ سال پرانی مسجد کی پشت پر ۳۰ سال پرانے فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ مسجد کے پیش امام مولانا محمد اسحاق صاحب کے قیام کا بندوبست وہیں تھا۔ نوجوان ہیں' چہرے بشرے سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ پاکستان کے شہر شیخوپورہ کے باشندے ہیں۔ جماعت اسلامی کے تعلیمی مرکز منصورہ کے پڑھے ہوئے ہیں: ان سے پہلے مولانا محمد انور قاسمی صاحب ماریشس میں مقیم تھے۔ وہ واپس گئے تو مولانا محمد اسحاق بھیجے گئے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اس چھوٹے سے جزیرے میں دین کی روایت کا کیا حال ہے۔ کہنے لگے کہ مجموعی طور پر لوگوں کا دین کے ساتھ لگاؤ ہے اور مسجدیں آباد ہیں۔ لیکن چونکہ معاشرہ ملا جلا ہے اس لئے ہمارے نوجوان جب باہر جاتے ہیں تو مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا بولے۔ "اس سطح پر معاملہ تھوڑا سا تشویشناک ہے۔ پھر بھی مجموعی طور پر دین سے محبت ہے۔ مختلف تنظیمیں اور جماعتیں کام کر رہی ہیں جس کا کافی اثر ہے۔ معاملات سو فی صد درست نہیں مگر اتنے زیادہ تشویشناک بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا کہ مجھے بطور خاص نوجوانوں کے بارے میں بتایئے' دین کے بارے میں لڑکے لڑکیوں کا رویہ کیا ہے۔"

مولانا محمد اسحاق نے کہا: الحمدللہ کافی لگاؤ رکھتے ہیں۔ نمازیوں میں بھی کافی نوجوان ہوتے ہیں۔ لیکن وہ معاشرے کے موجودہ ماحول سے کافی متاثر ہیں۔ نماز روزے کی حد تک تو دین سے ان کا تعلق ہے البتہ دوسرے معاملوں میں ان پر یورپین اثرات ہیں۔

میں نے پوچھا کہ ایسا ہونا فطری ہے۔ اب یہ بتایئے کہ حالات سے سمجھوتہ ہونا چاہئے یا نہیں؟۔

کہنے لگے —— "ہاں، مسلمان رہتے ہوئے سمجھوتہ کرنے کی اجازت ہے لیکن اعتقاد سے دستبردار ہو کر سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں ہر جگہ ہر حال میں مسلمان رہنا ہے۔ یہی بات اہم ہے۔ دنیا کے لئے بھی اور آخرت کے لئے بھی۔

اب میں نے اپنا اصل سوال پوچھا —— "مولانا، نوجوان نسل کے ذہن کو آپ کس قدر سمجھتے ہیں اور اس سے کیسے مخاطب ہوتے ہیں؟"

انہوں نے کہا۔ "میں خود نوجوان ہوں اس لئے نوجوانوں کے جذبات کو سمجھتا ہوں اور ان سے ان ہی کی زبان میں بات کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ بہت حد تک کامیاب ہوں۔ بہت سے بادین نوجوانوں کے انداز فکر میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ وہ پانچ وقت نماز ادا کرنے لگے ہیں۔ قرآن پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور دینی کاموں میں بہت تعاون کرتے ہیں۔ میں شروع میں اردو میں تقریر کیا کرتا تھا لیکن اسے پانچ دس فی صد لوگ سمجھتے تھے اور میری کاوش رائیگاں جاتی تھی۔ مجھے عربی کے بعد سب سے زیادہ محبت اردو سے ہے مگر تبلیغ میں

دشواری ہوتی ہے اس لئے مجبوراً مقامی بولی یعنی کریول کا سہارا لینا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا کہ پورے عالم اسلام میں انتشار ہے۔ عقیدوں میں فرق بڑھتا جا رہا ہے جو کشیدگی کا سبب بننے لگا ہے۔ ماریشس میں کیا صورت حال ہے؟

مولانا محمد اسحاق نے کہا کہ یہاں وہ کشیدگی نہیں جو برصغیر میں ہے۔ نہ ہی یہاں فرقے ان ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ دیوبندی، بریلوی کے ناموں تک سے واقف نہیں البتہ ان میں کچھ فرقوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً دیوبندی یہاں توحیدی کہلاتے ہیں، بریلوی اہل سنت کہلاتے ہیں۔ مگر ان کے درمیان لڑائی جھگڑا نہیں بلکہ مختلف فرقے آپس میں تعاون بھی کرتے ہیں۔ اب ایک بہت بڑی ختم نبوت کانفرنس ہو رہی ہے۔ مسلم پرسنل لا کی تحریک میں بھی تعاون کیا جا رہا ہے۔ ماریشس میں ملی جلی شادیوں کا مسئلہ ہے، یعنی مسلمان لڑکیاں "کافروں" کے ساتھ یا "کافر" لڑکیاں مسلمانوں کے ساتھ شادیاں کرلیتی ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لئے بھی سب فرقے متفق ہوئے اور سب نے اس کے تدارک کے لئے کام کیا۔

میں نے پوچھا کہ یہ مسئلہ آگے چل کر سنگین شکل اختیار کرلیتا ہے۔ آپ ان نوجوانوں کی مدد کرتے ہیں؟

مولانا بولے ——— "بہت۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اولاً ایسی شادیاں ہونے نہ پائیں۔ اس میں یہ ہے کہ مسلمان لڑکیاں بہت

کم دین سے باہر جاتی ہیں۔ اور اگر چلی جائیں تو ہماری کوشش یہ ہے کہ لڑکا مسلمان ہو جائے۔ ایسا نہ ہو تو لڑکی بالکل الگ تھلگ ہو کر رہ جاتی ہے اور پھر بہت سختیاں جھیلتی ہے۔ میں ایسے کئی کیس جانتا ہوں کہ سمجھانے بجھانے کے باوجود لڑکی نے غیر مسلم لڑکے سے شادی کی اور پھر برا حال ہوا۔ بعد میں وہ پچھتاتی ہیں اور نادم ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا کہ سنا ہے ماریشس کے مسلمانوں میں پیری مریدی' تعویذ' جنات اور جادو ٹونے کا بہت زور ہے۔

یہاں مولانا نے اپنی بات کو مصلحت کے لفظوں میں نہیں لپیٹا اور کہنے لگے کہ ہاں یہ سلسلہ مسلمانوں میں بے حد تشویشناک ہے (یہ الفاظ ان ہی کے ہیں) ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ ذہن کام نہیں کرتا کہ اس کا تدارک کیسے کیا جائے۔ ایسے ایسے ان ہونے واقعات سننے میں آتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی کہ ایک مسلمان اسلام پر یقین رکھتے ہوئے بھی خرافات پر اعتقاد رکھ سکتا ہے۔

پھر مولانا نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ "پچھلے رمضان میں یہاں ایک مصیبت آئی جس کو "لوغاؤ" کا نام دیا گیا۔ روزے برباد ہوئے' تراویح غارت ہوئی۔ وہ دن اتنی بے چینی سے گزرے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ ہر گھر میں پریشانی ہوئی۔ کسی کو خیال ہوا جادو ہے' اب کسی نے کہا جن آگیا' تعویذ کر دیا گیا۔ لوگ عاملوں کی طرف رجوع کرنے لگے۔ ان میں غیر مسلم بھی تھے۔ وقت برباد ہوا' پیسہ برباد ہوا۔ بسا اوقات لوگوں کی عزت تک داؤ پر لگ گئی۔ یہ سارے کے سارے نفسیاتی کیس تھے۔ میں نے ذاتی طور پر ایک بزرگ کو پاکستان سے

بلایا۔ وہ ماہر نفسیات تھے۔ میں نے کسی سے ایک پائی بھی نہیں لی اور انہیں اپنے خرچ پر بلایا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ زیادہ تر نفسیاتی معاملے ہیں جن کے بہت سے اسباب اور عوامل ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ کیا جہالت اس کا بنیادی سبب ہے؟

وہ بولے۔ "بد اعتقادی اس کا سبب ہے۔ اگر کسی کو دو چار روز بخار ہوا یا دردسر ہوا یا کاروبار میں خسارہ ہوا تو لوگ حقیقی اسباب سامنے نہیں رکھتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ اس میں جادو، تعویذ یا جن کی کارستانی ہے۔ حالت یہ ہے کہ مریض کو ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں لے جاتے۔"

پھر مولانا محمد اسحاق نے ایک صاحب کا قصہ سنایا —— "وہ میرے پاس آئے کہ ان کا بچہ اسکول جانے سے انکار کرتا ہے۔ سب کو خیال ہوا کہ کسی نے جادو ٹونہ کر کے اس کا دل اچاٹ کر دیا ہے۔ لیکن جب بچے سے پیار محبت سے بات کی گئی تو پتہ چلا کہ وہ ہوم ورک نہیں کرتا تھا۔ ٹیچر نے اسے ڈانٹا تو وہ ایسی حرکتیں کرنے لگا کہ اسے اسکول نہ بھیجا جائے حالت یہ ہو گئی تھی کہ بچے کی صحت پر اثر پڑا، اس کی تعلیم پر اثر پڑا۔ ماں باپ تعویذ لکھوانے لگے لیکن ذرا سی تحقیق سے اصل معاملہ سمجھ میں آ گیا۔"

مولانا یہ سارے واقعات سنا رہے تھے اور ان کی گود میں بیٹھا ڈھائی برس کا ان کا بیٹا اسامہ سارے مسئلوں سے بے نیاز اپنے کھلونے سے مسلسل کھیلے جا رہا تھا۔ ہر آنے والے کو سلام کر رہا تھا۔ ہر اجنبی کے سوال کے جواب میں اپنا نام بتا رہا تھا۔

ہندوستان پاکستان میں اس عمر کے بچے مہمانوں کو بابا بلیک شیپ سنایا کرتے ہیں اور تین سال کے ہو جائیں تو ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار سناتے ہیں اور چار برس کے ہو کر محلے کی لڑکیوں سے کہتے ہیں:

I Love You

نعمت، رحمت اور عورت

میں صبح نہا دھو کر ہوٹل سے باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ "عابدی صاحب، میرا نام صابرہ ہے، کل کانفرنس میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت میں یہاں آپ کے ہوٹل کے ریسپشن پر ہوں۔ کیا آپ نیچے آ کر مجھ سے مل سکتے ہیں، مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔"

میں آواز سے پہچان گیا۔ ہو نہ ہو یہ وہی خاتون ہیں جنھوں نے چادر کس کر سر ڈھانپ رکھا تھا۔

میرا خیال درست نکلا۔ وہی تھیں۔ آنکھوں میں آج ذرا سی وحشت تھی۔

"جی کہئے"

"آپ واپس لندن جا کر ریڈیو پر بولیں گے نا۔ کسی طرح پاکستان میں میرے شوہر کو یہ پیغام پہنچا دیجئے گا کہ بس اب وہ واپس آ جائیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔ کہاں ہیں آپ کے شوہر؟"

"تین مہینے کے لئے پاکستان گئے تھے، اب دس مہینے ہو گئے

ہیں، ابھی تک نہیں آئے۔ کیا آپ ریڈیو پر ان سے نہیں کہہ سکتے کہ آجائیں۔"

"وہ تو مشکل ہے، آپ خود جا کر انہیں کیوں نہیں لے آتیں۔"

"چلی تو جاؤں مگر چار چھوٹے چھوٹے بچوں کو کس پر چھوڑ کر جاؤں۔" یہ کہتے کہتے صابرہ کا سر جھک گیا اور موٹے موٹے آنسو ٹپک کر اسی چادر میں جذب ہونے لگے جسے کس کر اس نے اپنا سارا وجود ڈھانپ رکھا تھا۔

اس واقعے کے پورے ایک سال بعد میں نے ماریشس فون کر کے اپنے احباب سے پوچھا: صابرہ کا شوہر واپس آیا یا نہیں؟

جواب ملا: کوئی ایک صابرہ ہو تو آپ کے سوال کا جواب دیں۔ یہاں تو آپ کو ہر قدم پر ایک صابرہ ملے گی۔

ماریشس کا المیہ بیان کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔

فرض کیجئے کہ جنت میں لوگوں کے دن سکھ چین سے گزر رہے ہوں۔ ٹھنڈے چشمے بہہ رہے ہوں۔ ہر طرف تخت بچھے ہوں اور ان پر بیٹھے ہوئے لوگ نعمتیں اور راحتیں بٹور رہے ہوں کہ ایک روز بیچ کی دیوار گر جائے۔ دیوار گرے اور دوسری طرف کے لوگ، ترسے ہوئے اور محروم لوگ، ہوس پرست لوگ اٹھیں اور یلغار کر دیں۔

یہ بے لگام ہجوم آئے اور نعمتوں پر ٹوٹ پڑے۔ رحمتوں پر ٹوٹ پڑے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عورتوں پر ٹوٹ پڑے۔

یہاں ہماری کہانی میں ماریشس کا ایک اور کردار داخل ہوتا ہے

اور وہ ہیں شاہدہ کرمو۔

شاہدہ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ بڑی باصلاحیت ہیں اور دلچسپ بات یہ کہ صنعت کار ہیں۔ وہ لباس ڈیزائن کرتی تھیں۔ کرتے کرتے انہیں پولیس اور بینک کے عملے کی وردیوں اور یونی فارم کے ڈیزائن تیار کرنے کا کام مل گیا —— جب کام بڑھا تو انہوں نے چھوٹی سی فیکٹری کھولی۔ بہت سی عورتیں ملازم رکھیں اور نہ صرف اپنے ملک بلکہ فرانس اور امریکہ کی منڈیوں کے لئے بھی ملبوسات بنانے شروع کر دیئے۔

قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ شاہدہ کرمو کی فیکٹری میں جو عورتیں کام کرتی ہیں وہ اور طرح کی ہیں۔ بعض وہ ہیں جنہیں شوہروں نے ایک ہی ہلے میں تین طلاقیں دیں، چوٹی پکڑی اور گھر سے نکال دیا۔ چند وہ ہیں جن کے شوہر گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ کچھ ایسی ہیں جن کے شوہر منشیات کے لتی ہو گئے، زندہ ہیں مگر مردوں سے بد تر ہیں۔

کچھ عورتیں ایسی ہیں جن کے شوہر گھر میں گرل فرینڈ لانے لگے اور اب ان عورتوں کو جھوٹے برتنوں میں کھانا منظور نہیں۔ بعض لڑکیاں ایسی ہیں جنہوں نے اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کرنا چاہی تو والدین نے گھر سے نکال دیا، کچھ لڑکیوں نے غیر مذہب کے لڑکوں سے شادی کر لی اور ان کا جینا دوبھر کر دیا گیا —— اور یہ بتانا ضروری نہیں کہ یہ سب کی سب خواتین مسلمان ہیں۔

شاہدہ کرمو کے پاس علم اور دولت کے علاوہ غضب کی

دردمندی بھی ہے اور وہ جزیرے کی مسلمان عورتوں کے دکھ بٹانے میں جٹ گئی ہیں۔ وہ قدامت پرستی کی دشمن ہیں' جہالت کے خلاف تلوار سونتے کھڑی ہیں اور معاشرے کا ایک کردار جو انہیں بہت ستاتا ہے وہ 'خود ان کے بقول' مولوی ہے۔

مولوی کی بات چھڑی تو شاہدہ کرمو نے اتنے بہت سے قصے سنائے کہ ان کے لئے ایک الگ کتاب درکار ہو گی۔

ایک رات ایک لڑکی نے آکر ان کے دروازے پر دستک دی اور مدد مانگی۔ شاہدہ بتانے لگیں کہ خدا جانے اس سترہ سال کی لڑکی کے سر میں کیا سمائی کہ یہ مریدہ بننے کے لئے ایک مولوی صاحب کے پاس جا پہنچی۔ مولوی نے اسے تنہائی میں بلایا اور کہا کہ اپنا دوپٹہ اتارو۔ میں تمہیں اپنی چادر اڑھاتا ہوں جیسے اوڑھ کر تم جنت میں جا سکو گی۔ شاہدہ کے الفاظ میں "مولوی چار دن تک لڑکی کو اپنی چادر اڑھاتا رہا۔" آخر لٹی پٹی لڑکی شاہدہ کے پاس آئی۔ کہنے لگیں "میں سیدھی مولوی کے پاس گئی اور اس کی اچھی طرح خبر لی۔" خبر لینے کے طریقہ کار کی انہوں نے تفصیل نہیں بتائی۔

کہنے لگیں کہ حال یہ ہے کہ گھر میں بیٹی والدین کی مرضی کے خلاف ذرا سی بھی بات کرتی ہے تو اس پر سے جن اتروانے لگتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر جادو کا شبہ کرنے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کسی نے عمل کر دیا ہے چنانچہ جوابی عمل کراتے ہیں اور اس طرح اس سارے قصے میں وہ کردار دندناتا ہوا داخل ہو جاتا ہے جسے شاہدہ بار بار 'مولوی' کا نام دیتی ہیں۔

کہنے لگیں کہ ہر سال عید میلادالنبیؐ کے موقع پر برصغیر سے ایک نامور مولانا آتے ہیں اور میمن برادری ان پر دولت نچھاور کرتی ہے۔ ایک بار انہوں نے تقریر کی اور عورتوں کو ان کے فرائض یاد دلاتے ہوئے انہوں نے خصوصاً پردہ پر بہت زور دیا اور خواتین کو تاکید کرتے ہوئے کہا: شوہر کے سوا کسی مرد کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ۔

شاہدہ بتاتی ہیں کہ تقریر کے بعد مولانا صاحب بڑی سی شاندار کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر جلسہ گاہ سے جانے لگے تو عقیدت مند عورتوں نے ان کی کار پر دھاوا بول دیا۔ ہر عورت مولانا کے ہاتھ چومنا چاہتی تھیں۔ شاہدہ بتاتی ہیں کہ مولانا نے کار کی دونوں کھڑکیوں کے شیشے اتار کر ایک ایک ہاتھ باہر نکال دیا۔ اب عورتیں ٹوٹ پڑیں اور مولانا صاحب کے ہاتھ چومنے لگیں اور ان کا رومال اپنے سروں پر ڈالنے لگیں تاکہ شاہدہ کے بقول: ان کا جنت میں جانا یقینی ہو جائے۔
شاہدہ کرمو کہتی ہیں کہ وہ اگلے ہی روز مولانا کے پاس پہنچیں اور پوچھا کہ آپ نے غیر عورتوں کو اپنے ہاتھ چومنے کی اجازت کیوں اور کیسے دی؟

مولانا نے کہا کہ اتنا مجمع ٹوٹا پڑتا تھا۔ میں کیا کروں۔

میں شاہدہ سے باتیں کر رہا تھا۔ ان کے سوشل ورک کا تذکرہ تھا۔ ابھی ابھی میں ان کی فیکٹری دیکھ کر آیا تھا جہاں بہت سی مسلمان عورتیں کام کر رہی تھیں۔ اس میں اکثر ضرورت مند تھیں اور بہت سی مصیبت زدہ تھیں۔ میں نے پوچھا کہ ماریشس کے مسلمانوں کی گھریلو اور سماجی زندگی کیسی ہے؟ کہنے لگیں کہ زندگی روز بروز دشوار

ہوتی جا رہی ہے کیونکہ ہم ارتقا کے عمل سے گزر رہے ہیں مگر تیاری کے بغیر۔ ہم روایت بھی ترک کر رہے ہیں مگر خود کو تبدیل بھی نہیں کرنا چاہتے لہٰذا ہم ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ ہم جدید سوسائٹی میں رہتے ہیں، ہمارے بچے جدید ذہن بنا لیتے ہیں لیکن ہمارے بڑے اسے پسند نہیں کرتے۔

میں نے پوچھا کہ کیا گھروں میں بغاوت ہوتی ہے؟

جواب ملا ——— "خوب ہوتی ہے۔ پندرہ بیس فی صد تک نوجوان لڑکیاں اپنے گھر چھوڑ کر غیر مسلموں میں چلی گئیں۔ مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی شادیاں زیادہ عرصے نہیں چلتیں۔ اول تو والدین گھر سے جانے والی لڑکی سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اور ان سے کہہ دیتے ہیں کہ اب تم جانو۔ پھر بچے ہونے کے بعد مسئلے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ بچے کا نام کیا ہو۔ بیٹا ہے تو اس کی ختنہ ہونی چاہئے یا نہیں۔ مدراسی لڑکا کہتا ہے کہ میرا بیٹا آگ پر چلے گا۔ اس کا سر منڈے گا۔ مسلمان لڑکی مخالفت کرتی ہے اور محاذ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔

میرا اگلا سوال یہ تھا کہ مسلمان لڑکوں لڑکیوں کے شادیاں ٹھیک رہتی ہیں؟

شاہدہ بولیں۔ "نہیں وہ بھی نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ان میں سے پچاس فی صد شادیاں تو والدین یا خاندان والے طے کراتے ہیں۔ پچاس فی صد محبت کی شادیاں ہوتی ہیں جنہیں والدین قبول نہیں کرتے اور شادی کے بعد بچوں کے معاملوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔"

"اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔"

"یہی کہ جب نوجوان میاں بیوی کا جھگڑا ہوتا ہے تو کوئی انہیں سمجھانے یا مشورہ دینے والا نہیں ہوتا۔ شوہر شرابی ہو جاتے ہیں یا جرائم یا منشیات کی طرف نکل جاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا عورتیں بھی جرم کرتی ہیں؟"

وہ بولیں۔ "ہاں' جیل جاتی ہیں۔ اکثر بے گناہ بھی پھنستی ہیں۔ لوگ انہیں استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود جیل میں ہیں اور اصل مجرم فرار ہیں۔"

میں نے شاہدہ کرمو سے پوچھا۔ "کیا یہاں لڑکیوں کے بوائے فرینڈز ہوتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ خوب ہوتے ہیں۔ شادی شدہ عورتوں کے بھی ہوتے ہیں۔ پہلے انہیں بوائے فرینڈ کہتی ہیں' پھر منگیتر کہتی ہیں' اس کے بعد لڑکا بدل جاتا ہے اور قطع تعلق ہو جاتا ہے۔ اور ایک نئی چیز یہ ہوتی ہے کہ شوہر اپنی بیویوں کی قدر نہیں کرتے جبکہ دوسرے مردان کی تعریفیں کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وفاداریاں مشکوک ہو جاتی ہیں اور اس کے نتیجے میں بہت زیادہ گھر ٹوٹ رہے ہیں۔"

میں نے شاہدہ کرمو سے پوچھا۔ "آپ کا خواب کیا ہے؟"

"میرا سب سے بڑا خواب یہ ہے کہ معاشرتی فلاح و بہبود کی بہت بڑی تنظیم بناؤں۔ یہ تنظیم لوگوں کو تعلیم دے۔ انہیں ان کے حقوق اور فرائض بتائے مشکل میں گرفتار لوگوں کو مشورہ دے۔ بے گھروں کو پناہ گاہ فراہم کرے میری خواہش ہے ہر مسلمان یہاں آ کر اپنے دکھ سکھ بانٹے اور ایک نیا باشعور معاشرہ قائم ہو جو وقت کے قدم

سے قدم ملا کر ان لوگوں کی راہ پر چل سکے جن پر اللہ نے فضل کیا۔"
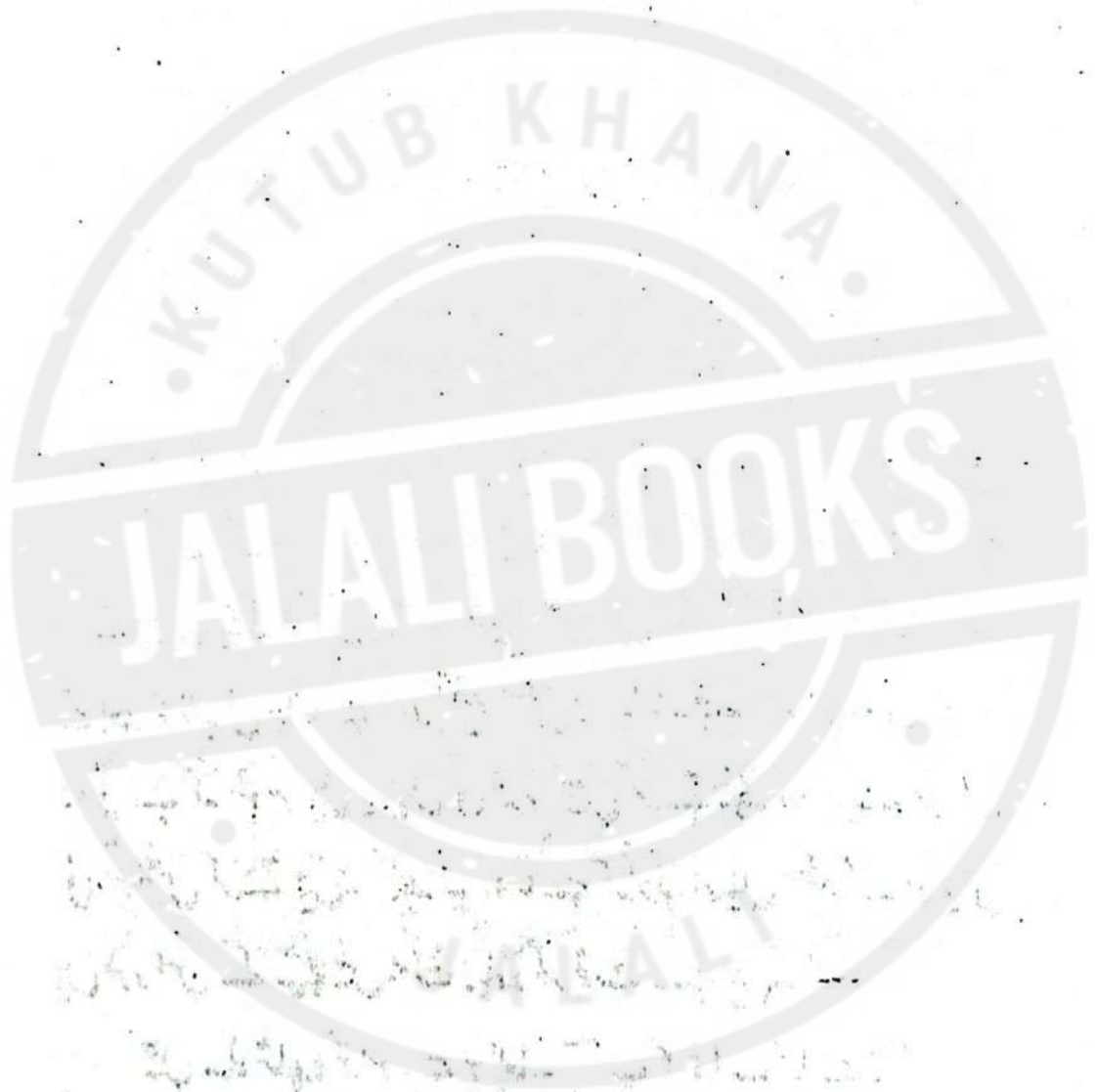
اگلے وقتوں کے لوگ

ایک روز میں نے صابر گودر سے کہا کہ ذرا اپنے شہر کے بڑے بوڑھوں سے ملواؤ۔ دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔ پرانے دن اچھے تھے یا آج کی زندگی زیادہ آرام دہ ہے؟۔

صابر مجھے علاقے کی گلیوں میں لے گئے۔ کلکتہ اسٹریٹ اور بمبئی اسٹریٹ جیسی گلیوں میں ہم ایک بزرگ کے پاس پہنچے۔

آپ کا نام کیا ہے؟

عمر ملو

آپ کی عمر کتنی ہے؟

خبر نہیں (گھر والوں نے بتایا کہ خیر سے ۹۵ برس کے ہیں)

آپ نے کبھی اردو زبان پڑھی تھی؟

ہاں۔ مگر کسی کام کی نہیں۔

والدین یاد ہیں؟

ہاں۔ ماں کا نام جھورن صاحب دین تھا۔

ان کا انتقال کب ہوا؟

میں چھوٹا سا تھا۔

بڑے ہو کر آپ نے کیا کیا؟

گنے کے کھیتوں میں کام کیا۔ مگر وہاں بڑا ظلم تھا۔ جھوٹ بول کر اس سے نجات پائی۔ پھر ایئرپورٹ پر ڈرائیور ہو گیا۔

کون سا زمانہ اچھا تھا؟

پرانا زمانہ اچھا تھا۔ چھوٹے ادب کرتے تھے اور سلام کرتے تھے۔ اب نہیں کرتے۔

عمر ملو بھوجپوری میں بول رہے تھے۔ آدھی باتیں میں خوب سمجھ رہا تھا۔ باقی صابر سمجھا رہے تھے۔

وہاں سے نکل کر ہم ایک بزرگ خاتون سے ملنے گئے۔ ان کے گھر والوں نے بتایا کہ وہ ۸۸ برس کی ہیں۔

آپ کا نام کیا ہے؟

خاتون ظہور۔ باپ کا نام ظہور۔

کہاں پیدا ہوئی تھیں؟

یہیں شہر میں۔

کبھی ہندوستان جانا ہوا؟

کبھی نہیں گئیں البتہ باپ جایا کرتے تھے۔

اپنی نوجوانی کا زمانہ یاد ہے؟

نہیں۔

باپ کا انتقال کب ہوا؟

یاد نہیں۔ اس کے مرید جانتے ہیں۔

کیا وہ پیر تھے؟

ہاں۔ پھر انہوں نے سب کچھ میرے شوہر کو دے دیا۔ میرے شوہر کے بھی مرید ہیں۔

کیا وہ کرامات دکھاتے تھے؟

ہاں۔ ان کے بہت مرید ہیں۔ جمعرات کو میرے پاس آتے ہیں اور میرے باپ کی درگاہ جاتے ہیں۔

آپ خود بھی جاتی ہیں درگاہ پر؟

نہیں۔ عورتوں کو وہاں جانے کا حکم نہیں۔

مریدوں کے لئے کیا آپ بھی دعا کرتی ہیں؟

ہاں۔ کر دیتے ہیں۔ قبول ہو یا نہ ہو۔ وہ جانے

آپ کے بچے ہیں؟

ہاں۔ ہیں۔ پوتے بھی ہیں۔ دادی کو دیکھنے آتے ہیں۔ باپ کا حکم ہے۔

کون سا زمانہ اچھا تھا؟

پہلے بھی اچھا تھا۔ اب بھی اچھا ہے۔ برابر ہے۔ فرق نہیں ہے۔

خاتون ظہور نے یہ ساری گفتگو اردو میں کی۔ اپنے اہل خانہ سے وہ کریول میں بات کرتی تھیں اور مجھ سے اردو میں۔ دیر تک اپنے والد اور شوہر کی تصویریں دکھاتی رہیں جو عربی لباس میں تھیں اور بعد میں ان میں رنگ بھرا گیا تھا'

خاتون ظہور سے دعا کی درخواست کر کے میں واپس لوٹنے لگا تو خیال رکھا کہ ان کی جانب پشت نہ ہونے پائے۔

اگلی ملاقات جن بزرگ سے ہوئی وہ تو گفتگو کا خزانہ تھے۔ سارے دن اور ساری تاریخیں ان کے حافظے میں محفوظ تھیں۔ ان سے باتیں نہ ہوتیں تو میرا ماریشس کا دورہ ادھورا رہ جاتا۔

صابر مجھے خالص مسلمانوں کے علاقے میں لے گئے جو آج تک لشکر کا علاقہ کہلاتا ہے۔ ایک قطار میں بہت سے ملتے جلتے مکان بنے ہوئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک پر ہم نے دستک دی۔ اندر ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔ ایک بزرگ نے بڑے تپاک سے دروازہ کھولا۔ اتنی ہی گرم جوشی سے اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ چھوٹا سا گھر بال بچوں اور دیر سے کھلے ہوئے ٹیلی ویژن سے بھرا ہوا تھا۔ ہر ایک نے باری باری آکر سلام کیا۔ صابر نے تعارف کرایا:

"یہ عابدی صاحب ہیں اور یہ ہمارے چچا ہیں"

یہاں پہنچ کر صابر نے چچا کا نام بتانے کی کوشش کی لیکن یہاں سے گفتگو کرنے کی ساری ذمے داری چچا نے سنبھال لی اور نہایت شستہ اردو میں بولے۔ "میرا نام نور محمد علی محمد ہے۔ عمر ۷۵ برس ہے۔ میں ۱۹۱۹ء میں کلکتے میں پیدا ہوا۔ میرے دادا ۱۸۶۸ء میں ماریشس آئے تھے۔ مایا رام دیا رام جہاز پر۔ میرے دادا بہت مشہور آدمی تھے۔ یوں ان کا نام عبدالرحیم محمد تھا مگر لوگ ان کو ناخدا نورانی کہتے تھے۔ وہ بہت بڑے بیوپاری تھے۔ ان کی وجہ سے نورانی خاندان کی آج تک شہرت ہے۔ میں خود دو مرتبہ ماریشس آیا۔ پہلے ۳۲ء میں اور پھر ۴۸ء میں کیونکہ یہاں یہ باپ دادا کی زمین ہے۔ میں نہ آتا تو یہ سرکار کے پاس چلی جاتی۔"

نور محمد علی محمد صاحب نے اپنی ساری سوانح اس طرح بیان کر دی کہ یا تو وہ ہر آنے جانے والے کے سامنے بیان کرتے رہتے ہیں یا میرے آنے کے خیال سے انہوں نے خوب اچھی طرح ریہرسل کر لی تھی۔

بڑے مزے کی باتیں کرتے ہیں اور دیر تک کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ ماریشس میں اب مہنگائی بہت ہے۔ امیروں کے لئے مزا ہے' غریبوں کو تکلیف ہے۔ پھر یہ کہ انسانی رشتے پہلے جیسے نہیں رہے۔ جوان تو اپنے رشتے داروں کو پہچانتے بھی نہیں۔

میں نے مختصر ترین سوال کیا ــــــ

"کیوں؟"

"یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ہمارے رسولؐ نے کہا تھا کہ آخری زمانے میں سب کچھ بدل جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "کیا آپ کے خیال میں آخری زمانہ قریب ہے؟"

"ہاں۔ آ رہا ہے۔ شروعات ہوئی ہے۔"

"اچھا اپنے بارے میں اور بتایئے۔"

"سنئے۔ میری ماں ۲۹ء میں گزر گئی۔ میں سترہ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں۔ بمبئی' کلکتہ' کولمبو' مدراس' رنگون' سب جگہ جا چکا ہوں۔ اس زمین کی خاطر ۴۸ء میں مجھے یہاں ماریشس آنا پڑا۔ یہاں ابراہیم داؤد کے ہاں نوکری کی۔ انہوں نے ۵۹ء میں ہماری شادی کرا دی۔"

"آپ نے لڑکی کو پہلے سے دیکھا تھا؟"

"نہیں۔ ہمارے باپ نے پسند کیا تھا۔"

"لڑکی نے آپ کو دیکھا تھا؟"

میرا سوال سن کر نور محمد علی محمد صاحب کی آنکھوں میں جگنو اڑنے لگے۔ بولے۔ "پانچ سال تک ہماری منگنی چلی۔ بیوی بدمعاش تھی۔ اس نے ایک روز چھپ کر ایک دعوت میں مجھے دیکھ لیا۔"

ان کی اس بات پر سارے گھر نے قہقہہ لگایا۔ خود بیوی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میری نگاہیں ان کے چہرے پر تھیں اور سوال میں ان کے شوہر سے کر رہا تھا: "لڑکی نے پسند کیا تھا آپ کو؟"

جواب ملا ــــــ "پسند کیا تبھی تو شادی کی۔ اب آج تک خوش ہوں۔"

"آپ نے اپنے بچوں کی شادیاں کر دیں؟"

"دو کی ہوئی ہیں۔ ایک لڑکی عاصی بائی (یا شاید آسی بائی) کی شادی ہوئی تو مجھے بہت اچھا داماد ملا ایک لڑکے کی شادی ہو گئی۔ وہ آرام سے ہے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی ہونی باقی ہے۔"

"کیا انہیں اپنی مرضی اور اپنی پسند سے شادی کرنے کی اجازت ہو گی۔"

"بالکل ہو گی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری لڑکی نے اپنی مرضی سے کی ہے البتہ لڑکے نے میری مرضی سے کی۔ اس نے کہا کہ لڑکی قبول کرے تو مجھے بھی قبول ہے۔ اس نے بھی لڑکی کو پہلے سے نہیں دیکھا تھا۔ بغیر دیکھے نکاح کیا۔ بہو بھی اچھی ملی۔"

میں نے پوچھا ــــــ "اولاد کا رویہ کیسا ہے ماں باپ کے ساتھ؟"

"میرا چالیس سال کا تجربہ یہ ہے کہ ماریشس میں لڑکا آپ کا نہیں ہوتا۔ پڑھایئے، لکھایئے لیکن منگنی کرو تو وہ ماں باپ کو بھول جاتا ہے البتہ سسر اور ساس کو یاد رکھتا ہے۔ ماں بولے گی کہ موٹر چاہیے تو کہے گا۔ میں مصروف ہوں۔ البتہ اگر ساس بولے گی تو فوراً حاضر ہو جائے گا۔ یہاں یہ حساب ہے۔ اس کے برعکس بیٹیاں ماں باپ پر مرتی ہیں۔ جس کے گھر میں بیٹی ہے وہ چین سے ہے۔ داماد آتا ہے تو اس کا ہو جاتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہاں بیٹی پیدا ہو تو خوشی مناتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ اللہ کی رحمت ہے۔"

میں نے پوچھا ــــــ "آپ کا زمانہ تکلیف کا تھا؟"

"جی نہیں۔ آرام کا تھا۔ آج پیسہ بہت ہے مگر چین نہیں ہے۔ پہلے کم آمدنی تھی مگر برکت تھی۔ پہلے بزرگ اللہ سے کہتے تھے: عزت دے، سلامتی دے۔ آج دولت مانگتے ہیں۔ اس نے دولت دی ہے مگر رزق کا اب وہ عالم نہیں۔ اب تو روٹی کے لئے ہر چیز کے لئے لائن میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کا علاقہ مسلمانوں کا ہے۔ اب نماز روزے کا کیا حال ہے؟"

بولے ــــــ "اب زیادہ ہے۔ اللہ کے فضل سے اچھے مولانا آتے ہیں۔ تبلیغ کرتے ہیں۔ مسجدوں میں نمازی بڑھ گئے ہیں۔ جن میں جوان بہت ہیں۔ روزے بہت رکھے جاتے ہیں۔ رمضان کے دنوں میں جشن ہوتا ہے اور مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتی ہیں۔"

"شیعہ سنّی، حنفی شافعی وغیرہ کا جھگڑا تو نہیں؟"

"نہیں ابھی نہیں ہے۔ مسجدیں الگ ہیں مگر جھگڑا نہیں ہے بلکہ آپس میں شادیاں بھی کر لیتے ہیں۔ محرم میں سنی بھی شیعہ بن جاتے ہیں۔" پھر آہستہ سے بولے۔ "کھچڑا کھانے کے لئے۔"

"حج پر جاتے ہیں؟"

"ہاں۔ بہت جاتے ہیں لیکن واپسی پر مال بہت لاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ والے کم ہیں اور کاروباری زیادہ ——— دینی تعلیم نہیں رہی۔ انگریزی میں بی اے کرتے ہیں۔ اردو میں زیرو ہیں۔"

"خود آپ نے اردو پڑھی ہے؟"

"ہاں۔ انڈیا میں سیکھی تھی۔ سرسید کا ایک مصرعہ سناؤں؟"

"جی، سنایئے۔"

"زندگی میں دشمنی پر باندھی تھی سراسر کمر
بعد مرنے کے آتے ہیں مزار پر
پتھر پڑیں تمہارے ایسے پیار پر"

"سرسید کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"انہوں نے حد سے زیادہ کام کیا۔ اقبال صاحب نے اور جناح صاحب نے بھی بہت کچھ کیا۔"

"مستقبل کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟"

"ابھی مایوس ہوں۔ آج سچا مسلمان کوئی نہیں ہے۔ اگر ان کا کوئی لیڈر ہوتا اور اگر یہ ایک ہوتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔"

ان کی ہر بات پر ہنسنے مسکرانے والا ان کا کنبہ ان کی اس بات پر سنجیدہ اور خاموش ہو گیا۔ اب گھر میں صرف ٹیلی ویژن بول رہا تھا۔

آخری خبریں آنے تک

۲۰ دسمبر ۱۹۹۵ء کو ماریشس کے عام انتخابات ہو چکے تھے۔ تیرہ سال سے حکمرانی کرنے والے اور ملک میں اقتصادی خوش حالی لانے والے وزیراعظم انرود جگناتھ اپنی شکست کا اعتراف کر چکے تھے اور حزب اختلاف کے رہنما نوین رام غلام جیت چکے تھے اور وہ بھی اس شان سے کہ پارلیمان میں ساٹھ کی ساٹھ نشستیں انہیں مل چکی تھیں۔

انرود جگناتھ ۱۹۸۲ء میں برسراقتدار آئے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے "اب لوگ دو وقت پیٹ بھر کر کھا سکتے ہیں' جب حکومت میں نے سنبھالی اس وقت ایسا نہ تھا۔"

یہ درست ہے۔ ۱۹۸۲ء میں یہ ایک یوں ہی سا جزیرہ تھا جس کی گزراوقات صرف گنے کی کاشت پر تھی۔

جگناتھ نے ماریشس کی منڈی ساری دنیا کے لئے کھول دی۔ دیکھتے دیکھتے گنے کے کھیتوں کے پچھواڑے فیکٹریاں سر اٹھانے لگیں۔ ایکسپورٹ پراسسنگ زون بننے لگے۔ ڈیوٹی فری چیزیں آنے لگیں جنہیں تیار مال کی شکل دے کر دوبارہ برآمد کیا جانے لگا۔ اب حالیہ

ہے کہ ماریشس میں مجموعی خانگی پیداوار کی شرح قریب قریب نو فی صد سالانہ ہے۔ فی کس آمدنی تین ہزار چار سو ڈالر ہے اور بیروزگاری کم ہو کر صرف ایک اعشاریہ چھ فی صد رہ گئی ہے۔ چھ سو صنعتی اداروں نے اسی ہزار افراد کو روزگار دے رکھا ہے جو کپڑے کے علاوہ پلاسٹک کی مصنوعات، کیمیاوی مصنوعات اور گھڑیاں بنا بنا کر برآمد کر رہے ہیں۔

۸۷ فی صد قابل کاشت اراضی پر گنا اگا ہوا ہے۔ ملک سے جتنا مال برآمد ہوتا ہے اس میں ایک تہائی شکر ہوتی ہے۔

نیلے ساحلوں کی دل کشی ہر سال دنیا بھر کے چار لاکھ سیاحوں کو گرم گرم سپاٹ ریت میں قدموں کے پہلے پہلے نشان بنانے کی دعوت دیتی ہے۔

اب ماریشس بین الاقوامی مالیاتی مرکز بننے والا ہے۔ ۹۸ء میں وہاں کی بینکاری دنیا بھر کے لئے کھل جائے گی جس میں ٹیکس کی بے پناہ رعایت ہو گی۔

ان تمام باتوں کے باوجود ماریشس کے عوام نے وزیر اعظم انرود جگناتھ کو بیک جنبش قلم اقتدار کے ایوانوں سے نکال باہر کیا ہے۔

کیوں؟

حکام پر کچھ تو دولت سمیٹنے کا الزام تھا۔ کچھ یہ الزام تھا کہ وہ جزیرے کی باون فی صد ہندو آبادی پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہیں لیکن جو چیز انہیں لے ڈوبی وہ تھیں ایشیائی زبانیں: ہندی، تامل، تیلگو، عربی اور اردو وغیرہ

حکومت نے اعلان کیا کہ پرائمری اسکولوں کی سطح ہی سے نہ صرف ان زبانوں کی تعلیم ہوگی بلکہ ان زبانوں کے امتحان بھی ہوا کریں گے۔

اس پر جزیرے کے غیر ایشیائی باشندے اٹھ کھڑے ہوئے:

ہمارے بچوں کا کیا بنے گا؟

اس طرح کے سوال اور اسی طرح کے الزام یکجا ہوئے۔ اوپر سے کہا گیا ہے کہ تیرہ سال بہت ہوتے ہیں۔ اب تبدیلی کی ضرورت ہے۔ پھر جو ووٹ ڈالے گئے تو اس شدت سے کہ وزیراعظم نے ان کی گنتی سے پہلے ہی ہار مان لی۔

نئی حکومت نے دولت کی لوٹ کھسوٹ بند کرنے کا وعدہ کیا ہے، آبادی کے تمام طبقوں کے ساتھ انصاف کا وعدہ کیا ہے۔ اقتصادی ترقی جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے اور ایشیائی زبانوں کو ترقی دینے کا وعدہ کیا ہے۔

دیکھیں، آنے والے تیرہ برس کیسے کیسے منظر دکھاتے ہیں۔

BIBLIOGRAPHY

ATMARAM, Pandit, **Truth At Last,** Port Louis, Mauritius, 1949.

BEATON, Rev. Patrick Beaton, **Creoles and Collies or Five Years in Mauritius,** London, 1859.

BENEDICT, Burton, **Mauritius: Indians in a Plural Society,** London, 1964.

BENEDICT, Burton, **Mauritius: Problems of a plural Society,** London, 1964.

BISSOONDOYAL, S., **A Concise History of Mauritius,** Bombay, India, 1965.

BISSOONDOYAL, U., (ed) **Indian Overseas: The Mauritian Experience,** Moka, Mauritius, 1844.

BLACKHOUSE, J., **A Narrative of a Visit to Mauritius and South Africa,** London 1844.

BRUCE, Sir Charles, **Mauritius Report,** 1898.

CARTER, Marina, **Lakshmi's Legacy,** Rose-Hill, Mauritius, 1994.

GHANNTY, Yacoob, **The Return of Big Dada** Port Louis, Mauritius, 1981.

HAMILTON, Sir Gordon, **Mauritius: Record of Private and Public Life,** Edinburgh, 1894.

HAZAREESINGH, K., **History of the Indians in Mauritius**, London, 1975.

ISSAC, A. H. & RAMAN, A. G., **The Jummah Maoque**, Port Louis, Mauritius, 1953.

Lady BURTRUM, **Re-collections of Seven Years Residence in Mauritius or Isle de' France**, London, 1830.

MACMILLAN, A., **Mauritius Illustrated**, London, 1914.

MALIM, Michael, **Island of the Swan**, London, 1952.

NAUDEER, Hassan Khan, **The Rose-Hill Mosque Case Record**, Port Louis, Mauritius, 1921.

ROY, Jay Narain, **Mauritius in Transition**, Allahabad, India, 1960.

رضا علی عابدی

ریل کہانی

جہازی بھائی (سفرنامہ)

کتب خانہ

جرنیلی سڑک (سفرنامہ)

شیر دریا

جان صاحب

اپنی آواز

اُردو کا حال

ملکہ وکٹوریا اور منشی عبدالکریم

نغمہ گر: برصغیر کے نغموں کی تاریخ۔ عوامی تھیٹر سے مقبول فلموں تک

اخبار کی راتیں (سرگزشت)

ریڈیو کے دن (سرگزشت)

کتابیں اپنے آباء کی

تمیں سال بعد: پہلا سفر اور ہمارے کتب خانے

پرانے ٹھگ

Rs. 600-00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-0677-4
ISBN-13: 978-969-35-0677-8